جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

# محدثِ عصر

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

# محدثِ عصر


نومبر ۲۰۱۹ء، جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۱۱، سلسلہ نمبر ۱۸۴





**شائع کردہ**

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484

ای۔میل: ahmadanzarshah@gmail.com

**اشتراک وتعاون**

**اندرون ملک:**

فی شمارہ-/15 سالانہ-/150

خصوصی-/1000

تاحیات -/10000

**بیرون ملک:**

سالانہ:20امریکی ڈالر

خصوصی:100امریکی ڈالر

تاحیات:500امریکی ڈالر





Composed By: Huda Computers Deoband 9456422412

# ورق در ورق

# عصریات

سیّد احمد خضر شاہ مسعودی

ہر آن بدلتے حالات اور ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات وحادثات، ان کی رفتار برق وصبا سے تیز، ایک کے بعد ایک وجود پذیر، ہر پیش آمدہ واقعہ گذشتہ واقعہ سے زیادہ دھماکہ خیز، قلم حیران وپریشان کہ کس موضوع کو منتخب کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے، حال ہی میں ملک کی اٹھارہ ریاستوں میں اکیاون نشستوں پر اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ضمنی الیکشن منعقد کئے گئے، انتخابی گہما گہمی، من پسند پارٹیوں میں امیدواروں کی آمد ورفت، ابھی ادھر تھے پلک جھپکنے میں اُدھر، نہ اخلاق پاؤں کی زنجیر بن سکے اور نہ نظریات، نہ پارٹی سے وابستگی کی قدامت راہ میں مزاحم، نہ عوامی دباؤ کارآمد، تمام اقدار روایات کو قتل کرکے اس کے لاشہ پر اقتدار کی کرسی نصب کرنے کی مذموم کوششیں پھر انتخابی جلسے جلوس، رائے دہندگان کو متوجہ کرنے کے لئے عجیب وغریب بھاشن، ان خرافات کو ''تقریر'' کا نام دینا اس لفظ کی معنویت اور وقار کی توہین ہے، فاسد خیالات متعفن، لب ولہجہ، نفرت انگیز بیانیہ، بھونڈے طور وطریق ان سب اجزاء پر مشتمل مرکب کا نام بھاشن ہے، عوام کا مزاج وذوق بھی اسی رنگ میں ڈھل گیا، اور ڈھال دیا گیا، غرضیکہ ان عبرت خیز اور وحشت انگیز مراحل سے گزر کر نتائج کی دہلیز تک پہنچنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔

حکمراں جماعت کے کارنامے اور حصولیابیاں کچھ اس عظیم الشان پیمانہ کی تھیں جن پر ان کو ناز تھا، کشمیر میں تازہ اقدامات، جو ستر سالوں میں کوئی سیاست داں یا پارٹی نہیں کرسکتی تھی، سرحدوں پر ملک دشمن طاقتوں کو منہ توڑ جواب، بلکہ ایسی کارروائی کہ جس کے نتیجہ میں ان کے زخم کبھی مندمل نہ ہوں گے، رام مندر کے منصوبے کی تشہیر، این آر سی کی تلوار، ملک کی دوسری بڑی اکثریت کے خلاف اعلیٰ مناصب پر فائز شخصیات کے واضح خوفناک بیانات، ایسی دل پسند اور جاذب نظر ودلفریب قبا کہ اس کی وسعت میں تمام مسائل اور ناکامیاں سما جاتی ہیں، اب نہ تیزی کے ساتھ کمزور ہوتی معیشت، نہ تجارت کی بگڑتی صورت

حال، نہ غم کاروبار نہ آلامِ روزگار، نہ فکر امروز نہ خوفِ فردا، رہی سہی کسر نتائج آنے کے بعد حکومت بنانے کی جدوجہد سے تکمیل پائی، دباؤ، پریشر، طمع ولالچ خریدوفروخت دھمکیاں، پیشکشیں تمام ہی ہتھیاروں کو حسبِ موقعہ آزمایا جاتا ہے، چنانچہ ایسا ہی سب کچھ اس الیکشن میں بھی نظارہ تھا، اگرچہ یہ چیز بہت واضح تھی کہ حکمراں جماعت کو جن نتائج کی توقع تھی یا جن کے وہ دعویدار تھے وہ ہاتھ نہ لگ سکے، بنیادی مسائل سے ورغلانے کی کوششیں صد فیصد کامیاب نہ ہوسکیں، انجام کار حکومت تشکیل دینے میں پھر وہ ہی اوچھے اور اخلاق باختہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے جو ماضی کے آزمودہ تھے۔مگر حقائق سے چشم پوشی کب تک؟ جھوٹ، کذب بیانی اور افتراء پردازی کی عمر بہت لمبی نہیں ہوتی، بہت جلد حقیقتوں کے طوفان کے سامنے یہ جھوٹ پر مبنی باندھ ریت کے ذرّات کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے۔

۞۞۞

۲۰۱۴ سے ملک کی سب سے بڑی جماعت اور سب سے زیادہ عرصہ اقتدار سے وابستہ پارٹی کانگریس عبرت ناک اضمحلال کا شکار ہے، درمیان میں وقفہ وقفہ سے یہ بھی باور کرنے میں دل ودماغ میں کشمکش ہوئی کہ اس کا وجود بھی باقی ہے یا سورگ باشی ہوچکی، چوٹی کے لیڈر عبرت وحسرت یاس وناامیدی کے بت بن گئے، دیدۂ حیران، زلف پریشان، اور وجود دھواں دھواں، لب بہ مہر اعضاء مفلوج، نہ چلت نہ پھرت، طوائف الملوکی کا شکار، تنظیمی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کر زمین بوس ہوگیا اعلیٰ قیادت تھک ہار کر دیوار کے ساتھ لگ گئی دوسری اور تیسری صف کا طبقہ تہی دست وتہی ظرف اچھل کود کرنے لگے، مگر حزب اقتدار کے جیالوں کی بد زبانی اور ذرائع ابلاغ کی یکطرفہ ہم عنانی کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چلنے والی تھی، اور نہ چلی۔

مہاراشٹر اور ہریانہ میں منعقدہ حالیہ الیکشن کے نتائج اور اس میں حاصل شدہ غیر متوقعہ نشستوں کے ہاتھ لگ جانے کے بعد عوامی موڈ اور رجحان، نیز ملک کی نبض کو پہچانتے ہوئے اب ہائی کمان نے ۵؍نومبر سے ۱۵؍نومبر تک ''حزبِ اقتدار'' کے خلاف ملک گیر احتجاج کرنے کا حوصلہ دکھایا ہے، جس کی رو سے حکومت کی کمزور اور غلط پالیسیوں معاشی انہدام وزوال بینکنگ کا ڈگمگاتا نظام، گرانی وگراں بازی کے خلاف مظاہرے کئے جائیں گے۔

گویا کہ اب کانگریس لنگر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر کر دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہے۔

ع دیکھیں گیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک

۞۞۞

یورپی یونین کی جانب ''منسوب'' ایک جہازی سائز کا ۲۸ رکنی وفد اچانک کشمیر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آدھمکا، اراکینِ وفد کی شخصیات کھنگالی گئیں، تو یہ عجیب وغریب خیالات اور متشدد رجحانات، نیز روایتی اسلام ومسلم دشمن مالیخولیا میں مبتلا، اس وفد کی درآمد کنندہ مسز مدھوشر مانامی خاتون ہیں، جو ایک غیر مسلم سرکاری تنظیم ''ویمن اکنامکس اینڈ سوشل تھنک ٹینک'' کی سربراہ ہیں، ہندوستانی نژاد ان محترمہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ گذراوقات کے لیے وہ کبھی سموسے بنا کر فروخت کیا کرتی تھیں، تاہم اب وہ ایک ایسے ادارے کی سربراہ ہیں جو جنوبی افریقہ، یورپی ممالک اور انڈین حکومت کے ساتھ ملکر کام کرتا ہے، اراکین وفد کو دعوت نامے، وفد میں شرکت کی شرائط وضوابط سے آگاہی محترمہ کی ہی ذمہ داری تھی، حزبِ اختلاف کے چوٹی کے لیڈر حکومت کے اس اقدام پر چیں بجبیں تھے، تاآں کہ شدت تاثر میں پریس کانفرنس منعقد کرکے وفد کی حیثیت پر گفتگو کی اور اس کو بے وقعت قرار دیا، ادھر یورپی یونین نے واضح طور سے یہ اعلان کرکے یہ وفد ''غیر مستند'' ہے اس کی ہوا نکال دی۔

بہرحال یہ سوال تو بجا ہے اور اپوزیشن اسے پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ ملک کی حزب اختلاف کے لیڈروں کو تو دورۂ کشمیر اور معائنہ کی اجازت نہ ہو اور ایک خلائی مخلوق آئے اور گھروں میں تانک جھانک کرے، اور ''آدھا تیر آدھا بٹیر'' بیان دے کر ہوا ہوائی ہو جائے، برطانیہ میں لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے رکن مسٹر کرس ڈیوس کو بھی اس دورہ کا دعوت نامہ بھیجا گیا تھا، مگر مسٹر کرس کے مطابق جب انھوں نے کشمیر میں عوام سے آزادانہ طور پر بات کرنے کی اجازت کی خواہش کا اظہار کیا تو حکومت ہند کی جانب سے یہ دعوت نامہ واپس لے لیا گیا، یہ طرزِ عمل وفد کی حیثیت اور اس کے مقاصد کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

❁❁❁

# بے فکری، ظاہری و باطنی امراض کی جڑ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

## بلاشبہ اکثر امراض کی جڑ بے فکری ہے

اکثر غلطیوں بدتمیزیوں کا صدور بے فکری سے ہوتا ہے۔(الافاضات الیومیہ:5/292)

## بے فکری جرمِ عظیم ہے

اکثر لوگ ناتمام یا بے تحقیق بات کر دیتے ہیں، جس سے دوسروں کو غلط فہمی یا اذیت ہوتی ہے تو یہ اپنی ذات میں معمولی بات ہے، لیکن اس کا منشا ہے بے فکری اور وہ جرم عظیم ہے لیکن باوجود اس جرم عظیم کے اگر کسی کا فہم صحیح ہے تو اس سے امید اصلاح کی ہوتی ہے کہ ذرا توجہ کرے گا تو قصدِ اصلاح سے یہ بے فکری کا مرض جاتا رہے گا۔(الاضافات الیومیہ:ا/418)

## بے فکری کو مکمل طور پر ترک کرنے کی ضرورت

بے فکری ایسی چیز ہے کہ اس سے دوسرے کو جس قدر اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے، وہ اس بے فکری کی بدولت پہنچتی ہے۔ اگر فکر ہو، اہتمام ہو، خیال ہو تو کبھی دوسرے کو اذیت نہ پہنچے، لیکن لوگوں کی بے فکری اور بے پروائی کی حد نہیں۔ عادتیں پڑی ہوئی ہیں، چھوڑنا مشکل ہے، اس بے حسی کا کیا علاج کہ نہ اپنی تکلیف کا احساس اور نہ دوسرے کی تکلیف کا احساس۔(الافاضات الیومیہ:2/22)

## ہر غلطی کا منشا بے فکری ہے

ایک صاحب ایسی جگہ بیٹھے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو بیٹھنے کا سلیقہ نہیں۔ اس پر وہ شخص وہاں سے اٹھ کر ایک اور صاحب کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ اس پر حضرت حکیم الامتؒ نے بطور تنبیہ کے فرمایا تم میں ایسی کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہو جس سے ایک مسلمان کی طرف پشت کر کے بیٹھے؟ عرض کیا غلطی ہوگئی۔ فرمایا کہ غلطی کا منشا کیا تھا؟(الافاضات الیومیہ:2/113)

ظاہر ہے اس غلطی کا منشا بے فکری تھا، مگر وہ صاحب مختلف تاویلات کرتے رہے۔

## دوسروں کی فضول فکر اپنی بے فکری کے باعث ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ دوسروں کی فضول فکر اور دوسروں کے معاملات میں بلاضرورت دخل دینا آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے اور یہ اس راہ میں سمِّ قاتل ہے کہ اپنے اختیارات کا تو اہتمام نہ کرے اور دوسروں کے اختیارات میں مشغول ہو جاوے، جو اس کے اعتبار سے غیر اختیاری ہے، اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔

کار خود کن، کار بیگانہ مکن

یعنی اپنا کرو، دوسرے کا کام مت کرو۔ (الافاضات الیومیہ: 1/273)

کسی (کامل شیخ) کے پاس رہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک انسان کو اپنی اصلاح اور تربیت کی فکر نہ ہو؟ (الافاضات الیومیہ: 1/194)

حضرت حکیم الامتؒ اپنے رسالہ "**الخطوب المذيبة للقلوب المنيبة**" میں تحریر فرماتے ہیں: "تجربہ سے معلوم ہوا اور پہلے سے بھی معلوم تھا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے اس کی اصلاح کوئی (مخلوق) نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ نبی بھی۔ (اصلاح انقلاب امت: 2/8)

## اپنی فکر اصلاح ہر حال میں مقدم رکھنے کی ضرورت

بڑی ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنی فکر میں لگے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے۔ آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے، عوام میں بھی اور خواص میں بھی کہ دوسروں کی تو اصلاح کی فکر ہے، اپنی خبر نہیں۔ میرے ماموں صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بیٹا! دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت کی فکر میں کہیں اپنی گٹھڑی نہ اٹھوا دینا۔ واقعی بڑے کام کی بات فرمائی۔ (الافاضات الیومیہ: 1/11)

حضرت حکیم الامتؒ کے ایک خلیفہ مجاز حضرت حاجی شیر محمد صاحبؒ نے اپنے صاحب زادہ کو دینی تعلیم دلوائی۔ اس کے باوجود انہوں نے ڈاڑھی منڈوالی۔ تو حضرت حاجی شیر محمد صاحبؒ نے حضرت حکیم الامتؒ کو اطلاع دی اور عرض کیا کہ حضرت ان کے اس عمل سے ساری رات نیند نہیں آتی۔ حضرت حکیم الامتؒ نے جواباً تحریر فرمایا۔

فکر خود کن، فکر بیگانہ مکن
در زمین غیر خود خانہ مکن

یعنی اپنی فکر کیجیے دوسرے کی فکر نہ کیجیے دوسرے کی زمین میں اپنا مکان نہ بنائیے (ورنہ مالک زمین اسے گرادے گا)۔یعنی اختیاری حد تک جب آپ پوری جدوجہد اور کوشش کر چکے، اس کے بعد اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہاں دعا کا مضائقہ نہیں۔

## بدفہمی لاعلاج مرض ہے

اگر بےفکری کے ساتھ بدفہمی بھی ہو تو اس کا علاج بہت گراں ہے۔(الافاضات الیومیہ:1/418)

## بدفہمی غیر اختیاری اور بےفکری اختیاری مرض ہے

بدفہمی تو غیر اختیاری چیز ہے، اس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ہاں! بےفکری سبب ہو تو اختیاری ہے، اس کا علاج ہوسکتا ہے، یعنی جب بھی فکر سے کام لے گا اصلاح کی امید ہوسکتی ہے۔(الافاضات الیومیہ: 72/7)

## بےفکری کی خرابیاں

آج کل لوگوں کو ایسی باتوں کا بالکل خیال نہیں کہ ہمارے اس فعل سے دوسرے پر کیا اثر ہوگا، جو جی میں آیا کرلیا۔غور وفکر سے کوئی نہیں کرتے۔یہ سب اسی بےفکری کی خرابی ہے۔اس وقت مسلمانوں میں نہ دنیا ہی کی فکر ہے، نہ آخرت کی؛ بڑے افسوس کی بات ہے۔(الاضافات الیومیہ:7/182)

## بےفکری کا منشا بےوقعتی ہے

بےفکری کا منشا اور مبنیٰ میں خوب سمجھتا ہوں کہ بےوقعتی اس کا سبب ہے، لوگوں کے یہاں یہ بات ہلکی ہے، مگر میرے نزدیک بھاری ہے۔(الاضافات الیومیہ:8/249)

## مزاج میں بےفکری کی دلیل

جس وقت سے لفافہ پر ڈاک ٹکٹ میں اضافہ ہوا ہے، حضرت حکیم الامتؒ نے ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ منگوا لیے اور نئے قواعد ڈاک کے مطابق جوابی لفافوں اور کارڈوں پر ٹکٹ چسپاں کرتے رہے اور یہ نیت کرلی کہ جس روز پوری ڈاک میں مکمل ٹکٹ آنے لگیں گے، پھر اس روز سے اپنی طرف سے ٹکٹ نہ لگاؤں گا، چناں چہ جس روز سے ڈاک میں پورے ٹکٹ آئے، اس کے بعد پھر ایک لفافہ آیا، جس پر ٹکٹ کم لگے تھے۔اس پر ارشاد فرمایا کہ "جب سب جگہ محصول کا بڑھنا معلوم ہو چکا تو اس کا خیال ہونا چاہیے تھا، مگر پھر بھی خیال نہ ہونا نہایت ہی غفلت کی بات ہے۔بات یہ ہے کہ مزاج میں بےفکری

بہت ہے"۔(الاضافات الیومیہ:5/18)

## بے فکری کے کرشمے

اصل چیز بے فکری ہے، کوئی اصول ہی نہیں۔ بولنے کے موقع پر خاموش رہنا اور خاموشی کے موقع پر بولنا۔(الاضافات الیومیہ:ج4/232)

کئی روز ہوئے ایک منی آرڈر آیا تھا، کوپن پر کچھ نہ لکھا تھا کہ کس مد کا روپیہ ہے، میں نے یہی لکھ کر واپس کر دیا۔ آج پھر دوبارہ آیا، پھر بھی کوپن پر کچھ نہیں لکھا، باوجودیکہ غلطی پر متنبہ کر دیا تھا، مگر پھر وہی حرکت، آج پھر واپس کیا۔ یہ حالت ہے لوگوں کی بے فکری اور غفلت کی۔(الاضافات الیومیہ:5:253)

## زیادہ ناگواری بے فکری سے ہوتی ہے

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے سب دوست صحیح اصول پر ہوں، اگر ان کو اہتمام میں لگا دیکھتا ہوں تو معمولی غلطیوں سے درگزر کرتا ہوں، زیادہ ناگواری اس وقت ہوتی ہے جب کسی کو بے فکر دیکھتا ہوں۔ (الاضافات الیومیہ:2/63)

اصول وقواعد کی برکت اور ضرورت یہ سب باتیں فکر سے پیدا ہوتی ہیں، طریقے سے ہر کام ہو جاتا ہے اور کوئی گرانی نہیں ہوتی اور نہ کوئی حرج ہوتا ہے، مگر ساری خرابی بے فکری سے ہوتی ہے۔ لوگوں میں فکر کی عادت پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر لوگ بھاگتے ہیں اور گھبراتے ہیں۔(الافاضات الیومیہ:5/135)

## بے فکری کے مرض سے اس وقت مشائخ بھی خالی نہیں

ان لوگوں نے اپنی دکانیں جما رکھی ہیں، ہر وقت اس کی فکر ہے کہ کوئی ہم کو برا نہ کہے، کوئی غیر معتقد نہ ہو، اچھی خاصی دین فروشی اور مخلوق پرستی ہے، میرے نزدیک وہ شیخ خائن ہے، راہ زن ہے جو اللہ کی مخلوق کی راہ مارے اور اپنے اغراض ومصالح کی بنا پر مخلوق کی تربیت نہ کرے؛ یہ سب فساد بے فکری کی بدولت ہوتا ہے، اگر اپنی عاقبت اور دین کی فکر ہو تو ہرگز ایسا نہ کریں اور اسی پر بس نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر خلاف شرع بکواس لگاتے ہیں، بڑھیں ہانکتے ہیں اور وہ امور اور اسرار سمجھے جاتے ہیں، اشرار کا نام اسرار رکھا ہے، احکام شرعیہ میں تحریف کرتے ہیں اور فن تصوّف کی وہ گت بناتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔(الافاضات الیومیہ:1/501)

## امراض روحانی سے بالکل بے فکری

اگر کوئی بیمار ہو اور لوگ اس کو علاج سے بے فکر دیکھیں تو چاروں طرف سے اس پر لتاڑ پڑتی ہے، جس سے وہ اپنی فکر میں لگ جاتا ہے، ایسے شخص کی امید صحت کی ہوتی ہے۔ افسوس تو اس شخص کی حالت پر ہے کہ تمام دنیا اس کو تن درست سمجھے ہوئے ہے اور وہ بیمار ہے، دوسروں کے تن درست سمجھنے پر بھی اپنے کو تن درست سمجھ بیٹھا، ایسے مریض کے تن درست ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ (الاضافات الیومیہ: 1/ 147)

## اکثر بے اعتدالیوں کا منشا بے فکری ہے

اصل مقصود فکر ہے، آج کل اکثر بے اعتدالیوں کا منشا بے فکری ہوتی ہے۔ (خیر الافادات، ملفوظ نمبر 52)

آج کل اکثر لوگ مبہم بات کرتے ہیں، اس کا منشا بھی بے فکری ہے، یہ نہیں سوچتے کہ اس سے مخاطب کو تکلیف پہنچتی ہے؛ غرض اصلاح ظاہر و باطن بے فکری چھوڑنے اور ہر وقت فکر آخرت و عاقبت کے التزام سے ہوگی۔

کام یابی تو کام سے ہوگی　　نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی　　ذکر کے التزام سے ہوگی

❁❁❁

# مادّیت کا فتنہ اور اُس کا علاج!

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

آج کل دنیا طرح طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے، ان سب فتنوں میں ایک بنیادی اور بڑا فتنہ ''پیٹ'' کا ہے۔ شکم پروری و تن آسانی زندگی کا اہم ترین مقصد بن کر رہ گیا ہے، ہر شخص کا شوق یہ ہے کہ لقمۂ تر اس کی لذتِ کام و دہن کا ذریعہ بنے اور یہ فتنہ اتنا عالمگیر ہے کہ بہت کم افراد اس سے بچ سکے ہیں، تاجر ہو یا ملازم، اسکول کا ٹیچر ہو یا کالج کا پروفیسر، دینی درس گاہ کا مدرس ہو یا مسجد کا امام اس آفت میں سبھی مبتلا نظر آتے ہیں، ہاں فرقِ مراتب ضرور ہے۔ زہد وقناعت، ورع وتقویٰ اور اخلاص و ایثار جیسے اخلاق وفضائل اور ملکات کا نام ونشان نہیں ملتا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا پورا عالم ساز وسامان کی فراوانی کے باوجود حرص وآز، طمع ولالچ اور زرطلبی وشکم پروری کی بھٹی میں جل رہا ہے اور کرب واضطراب، بے چینی وبے اطمینانی اور حیرت وپریشانی کا دھواں ہر چہار سمت پھیلا ہوا ہے۔ دراصل اس فتنۂ جہاں سوز کا بنیادی سبب یہی ہے جس کی نشاندہی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی، آخرت کا یقین بے حد کمزور اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا تصور قریباً ختم ہو چکا ہے، مادی نعمتیں اور ان کا تصور اس قدر غالب ہے کہ روحانی قدریں مضمحل ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے آج انسانوں کی چھوٹائی بڑائی، عزت وذلت اور بلندی وپستی کی پیمائش ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ'' کے پیمانے سے نہیں ہوتی، بلکہ ''پیٹ اور جیب'' کے پیمانے سے ہوتی ہے۔ مادیت کے اس سیلاب میں پہلے ایمان ویقین رخصت ہوا، پھر انسانی اخلاق ملیا میٹ ہوئے، پھر اسوۂ نبوت سے وابستگی کمزور ہو کر اعمال صالحہ کی فضا ختم ہوئی، پھر معاشرت ومعاملات کی گاڑی لائن سے اتری، پھر سیاست وتمدن تباہ ہوا اور اَب مادیت کا یہ طوفان انسانیت کو بہیمیت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ افراتفری اور بے اصولی، آوارگی وبے راہ روی اور بے رحمی وشقاوت کا وہ دور دورہ ہے کہ الامان والحفیظ۔ الغرض اس ''پیٹ'' کے فتنے نے ساری دنیا کی کایا پلٹ کر ڈالی۔ دنیا بھر کے عقلاء ''پیٹ'' کی فتنہ سامانی کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں، وہ اس فتنہ کے ہولناک نتائج کا تدارک بھی کرنا چاہتے ہیں، مگر صد حیف کہ علاج کے لیے ٹھیک وہی چیز تجویز کی جاتی ہے جو خود سبب مرض ہے۔ درحقیقت

انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہی انسانیت کے نباض ہیں اور انہی کا تجویز کردہ علاج اس مریض کے لیے کارگر ہوتا ہے۔حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس ہولناک مرض کی صحیح تشخیص بہت پہلے فرمادی تھی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''واللہ لا الفقر أخشى علیکم ولکن أخشى علیکم أن تبسط علیکم الدنیا کما بسطت على من کان قبلکم فتنافسوها کما تنافسوها فتهلککم کما أهلکتهم۔''(صحیح البخاری) ''بخدا! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ قطعاً نہیں، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم پر دنیا پھیلائی جائے،جیسا کہ تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی، پھر تم پہلوں کی طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرو، پھر اس نے جیسے ان کو برباد کیا تمہیں بھی برباد کرڈالے۔'' لیجیے! یہ تھا وہ نقطۂ آغاز جس سے انسانیت کا بگاڑ شروع ہوا، یعنی دنیا کو نفیس اور قیمتی چیز سمجھنا اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس پر جھپٹنا، پھر آپ ﷺ نے تشخیص پر ہی اِکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے ایک جامع نسخۂ شفاء بھی تجویز فرمایا،جس کا ایک جزء اعتقادی ہے اور دوسرا عملی۔اعتقادی جزء یہ کہ اس حقیقت کو ہر موقع پر مستحضر رکھا جائے کہ اس دنیا میں ہم چند لمحوں کے مہمان ہیں، یہاں کی ہر راحت وآسائش بھی فانی ہے اور ہر تکلیف ومشقت بھی ختم ہونے والی ہے، یہاں کے لذائذ وشہوات آخرت کی بیش بہا نعمتوں اور ابدالآباد کی لازوال راحتوں کے مقابلہ میں کالعدم اور ہیچ ہیں،قرآن کریم اس اعتقاد کے لیے سراپا دعوت ہے اور سینکڑوں جگہ اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے،سورۃ الاعلیٰ میں نہایت بلیغ مختصر اور جامع الفاظ میں اس پر متنبہ فرمایا: '' بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ ''۔(الاعلیٰ:۱۶،۱۷) ''کان کھول کر سن لو! (کہ تم آخرت کو اہمیت نہیں دیتے) بلکہ دنیا کی زندگی کو (اس پر) ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور لازوال ہے۔'' اور عملی حصہ اس نسخہ کا یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں مشغول ہوا جائے اور بطور پرہیز کے حرام اور مشتبہ چیزوں کو زہر سمجھ کر ان سے کلی پرہیز کیا جائے اور یہاں کے لذائذ وشہوات میں انہماک سے کنارہ کشی کی جائے۔دنیا کا مال واسباب، زن وفرزند،خویش واقرباء اور قبیلہ وبرادری کے سارے قصے زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھ کر صرف بقدرِ ضرورت ہی اختیار کیے جائیں،ان میں سے کسی چیز کو بھی دنیا میں عیش وعشرت اور لذت وتنعم کی زندگی گزارنے کے لیے اختیار نہ کیا جائے،نہ یہاں کی عیش کوشی کو زندگی کا مقصد اور موضوع بنایا جائے۔آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: '' إياک والتنعم، فإن عباداللہ لیسوا بالمتنعِّمین۔''(مشکوۃ) ''عیش وتنعم سے پرہیز کرو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش پرست نہیں ہوتے۔'' عجیب متضاد طرزِ عمل ہے کہ اگر کسی ڈاکٹر کی رائے ہو کہ دودھ، گھی، گوشت، چاول وغیرہ کا استعمال مضر ہے تو اس کے مشورے اور اشارے سے تمام نعمتیں ترک کی جاسکتی

ہیں، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کے واضح ارشادات اور وحی آسمانی کے صاف احکام پر ادنیٰ سے ادنیٰ لذت کا ترک کرنا گوارا نہیں، نبی کریم ﷺ اور ور آپ ﷺ کی آل واصحاب کی زندگی اور معیارِ زندگی کو اول سے آخر تک دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی نعمتوں سے دل بستگی سراسر جنون ہے۔''صحیح بخاری شریف'' میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قصہ مروی ہے کہ کچھ لوگوں پر ان کا گزر ہوا، جن کے سامنے بُھنا ہوا گوشت رکھا تھا، انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو کھانے کی دعوت دی، آپؓ نے انکار کردیا اور فرمایا کہ''محمد ﷺ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہ کھائی۔'' (صحیح البخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یأکلون، ج:۲، ص:۸۱۵، ط: قدیمی)

مہینوں پر مہینے گزر جاتے، مگر کاشانۂ نبوت میں نہ رات کو چراغ جلتا نہ دن کو چولہا گرم ہوتا، پانی اور کھجور پر گزر بسر ہوتی، وہ بھی کبھی میسر آتیں کبھی نہیں، تین تین دن کا فاقہ ہوتا، کمر سیدھی رکھنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھے جاتے اور اسی حالت میں جہاد وقتال کے معرکے ہوتے، الغرض زہد وقناعت، فقر وفاقہ، بلند ہمتی وجفاکشی اور دنیا کی آسائش سے بے رغبتی اور نفرت وبیزاری سیرتِ طیبہ کا طغرائے امتیاز تھی۔اپنی حالت کا اس''پاک زندگی'' سے مقابلہ کرنے کے بعد ہم میں سے ہر شخص کو شرم آنی چاہئے، ہمارے یہاں سارا مسئلہ روٹی اور پیٹ کا ہے اور وہاں یہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، ظاہر ہے کہ یہ زندگی بالقصد اختیار کی گئی تھی، تاکہ آئندہ نسلوں پر خدا کی حجت پوری ہوجائے، ورنہ آپ ﷺ چاہتے تو آپ کو منجانب اللہ کیا کچھ نہ دیا جاسکتا؟ مگر دنیا کا یہ ساز وسامان جس کے لیے ہم مرکھپ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس قدر حقیر وذلیل ہے کہ وہ اپنے محبوب اور مقرب بندوں کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا، بعض انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو عظیم الشان سلطنت بھی دی گئی، مگر ان کے زہد وقناعت اور دنیا سے بے رغبتی وبیزاری میں فرق نہیں، ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لیے تھا، اپنے نفس کے لیے کچھ نہ تھا۔الغرض یہ ہے''فتنۂ پیٹ'' کا صحیح علاج جو انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور بالخصوص سید کائنات ﷺ نے تجویز فرمایا، اور اگر انسان''پیٹ کی شہوت'' کے فتنہ سے بچ نکلے تو ان شاء اللہ!''شہوتِ فرج'' کے فتنہ سے بھی محفوظ رہے گا کہ یہ خرمستی پیٹ بھرے آدمی کو ہی سوجھتی ہے، بھوکا آدمی اس کی آرزو کب کرے گا۔ان ہی دو شہوتوں سے بچنے کا نام اسلام کی اصطلاح میں''تقویٰ'' ہے جس پر بڑی بشارتیں دی گئی ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ضعیف مریض کو بقائے حیات کے لیے ہلکی پھلکی معمولی غذا کا مشورہ دیا جاتا ہے اور زبان کے چسکے سے بچنے کی سخت تاکید کی جاتی ہے، تاکہ مطلوبہ اعلیٰ صحت نصیب ہو، بس یہی حیثیت اسلام کی نظر میں دنیا کی ہے۔

# ماہِ ربیع الاوّل کی آمد اور اس کے تقاضے

مفتی محمد صادق حسین قاسمی

ماہِ صفر کے بعد ربیع الاول کی آمد ہوتی ہے، ربیع بہار کو کہتے ہیں، اسی مہینہ میں خزاں رسیدہ چمن میں بہار جاوداں آئی، دم توڑتی انسانیت کو حیاتِ نو دینے، پامال ہوتی شرافتوں کو بچانے، بے دینی، بداعمالی اور کفر وشرک کے سیلاب بلا خیز میں تھپیڑے کھاتی مخلوق کو ایمان واسلام کے ساحل سے ہمکنار کرنے اور خالق سے جوڑنے کے لئے عظیم ہستی، محسنِ انسانیت، خاتم النبیین ﷺ کی آمد آمد ہوئی۔یعنی ربیع الاول ہی کے مہینہ میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔آپ ﷺ کی تاریخِ ولادت کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن مہینہ کے سلسلہ میں تقریباً اتفاق ہے کہ ربیع الاول ہی کے مبارک مہینہ میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔اس اعتبار سے ربیع الاول کا مہینہ ایک عظیم اور تاریخی مہینہ ہے، جس میں ایک مسلمان کے لئے جہاں خوشی ومسرت کے سوغات ہیں وہی اپنے پیارے اور محسن نبی ﷺ کی تعلیمات کے پیغامات بھی ہیں جو دراصل ہمارے تعلق اور رشتۂ الفت کو مضبوط کرنے اور فدائیت وفنائیت کی سچی ترجمانی کرنے والے ہیں۔

ماہِ ربیع الاول میں جہاں مسلمانوں کو خوشی ہوتی ہے کہ اسی مہینہ میں فخرِ کائنات، امام الانبیاء ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، وہیں یہ احساس بھی بے قرار کردیتا ہے کہ اسی مہینہ کی 12 تاریخ کو رحمۃ للعالمین ﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا، یعنی ربیع الاول کا مہینہ آپ ﷺ کی ولادت اور رحلت کا مہینہ ہے۔یہ مہینہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں انسانیت کے سب سے بڑے اور حقیقی خیرخواہ سید الرسل حضرت محمد ﷺ آئے اور انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں انقلاب برپا کیا، دلوں کی دنیا بدلی، تمناؤں اور آرزؤں کے رخ کو موڑا، اور جو خود سیدھے راستے پر نہیں تھے اپنی نرالی اور انقلابی تعلیمات کے ذریعہ انہیں آنے والے انسانوں کا امام بنایا۔قرآن کریم میں اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کو بطور احسان بیان

کرتے ہوئے ہوئے فرمایا: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ (آل عمران: 164)، ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جب کہ اس سے پہلے لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

ماہِ ربیع الاول ہر سال آتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے، وقتی طور پر مسلمان خوشی ومسرت کا اظہار کر دیتے ہیں، اور اپنے نبی ﷺ سے محبت کے ثبوت دینے کے لئے چند جلسوں کا اہتمام بھی کر لیتے ہیں، سیرت رسول ﷺ کو بیان کیا جاتا ہے اور رات دیر گئے تک تقاریر ہوتی ہیں، لیکن جوں ہی ربیع الاول کا مہینہ بلکہ 12 تاریخ گذر جاتی ہے، زندگی پھر اسی پرانی حالت پر اور سابقہ طرز پر آ جاتی ہے، جب کہ ماہِ ربیع الاول ایک پیغام دے رخصت ہوتا ہے، اپنے نبی پاک ﷺ سے محبت کا دم بھرنے والوں کو بیدار کر کے جاتا ہے، یہ مہینہ بھی اہل ایمان سے کچھ تقاضے کرتا ہے، جس مہینہ میں سرور دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی اور آپ ﷺ ساری انسانیت کے لئے پیغام ہدایت اور مژدۂ نجات لے کر آئے کیا اس مہینہ کا کچھ مطالبہ مسلمانوں سے نہیں ہوگا؟ یقیناً یہ مہینہ جہاں بہت قابلِ احترام اور لائق تعظیم ہے کیوں کہ اسی مہینہ میں خلاصۂ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے وہیں یہ مہینہ ہمارے ایمان کو جانچنے اور محبت رسول ﷺ کے پیمانوں کو ناپنے کا مہینہ میں بھی ہے۔ تو آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں کہ یہ مہینہ ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے اور اس مہینہ کی حقیقی قدر دانی کیا ہے؟

## سچی محبت کی ضرورت

ماہِ ربیع الاول اپنی آمد کے ساتھ اہل ایمان سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی سچی محبت کو پیدا کریں، حقیقی محبت کو بیدار کریں، ظاہری اور رسمی محبت سے ہٹ کر دل وجان سے نبی کریم ﷺ کو چاہا جائے، نبی کریم ﷺ سے محبت ایمان کا لازمی جزو ہے، آپ ﷺ سے محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا، قرآن وحدیث میں آپ ﷺ کی جہاں اطاعت وفرماں برداری کا حکم دیا وہیں آپ سے محبت کرنے کی تعلیم دی گئی، صحابہ کرام کی زندگیاں محبتِ رسول سے سرشار تھیں، وہ اپنے نبی کو دل وجان سے بڑھ کر چاہتے اور ان پر اپنی جان چھڑکتے تھے، محبتِ رسول میں ان لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں اور دنیا والوں کو بتایا کہ ہر رشتہ سے بڑھ کر نبی کا رشتہ ہے اور ہر ایک کی محبت سے زیادہ عزیز رسول اللہ ﷺ کی محبت ہے۔ دنیوی تعلقات اور رشتوں کی بناء پر اور دنیوی مال ومتاع کی

وجہ سے اگر محبت رسول میں کمی ہوگی یا اس سے صرف نظر کیا جائے گا تو قرآن کریم میں اس سلسلہ میں بڑی سخت وعید بیان کی گئی، ارشاد ہے: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ٰاِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۝ ۔(التوبۃ: 24) ترجمہ: ''(اے پیغمبر! مسلمانوں سے ) کہہ دو کہ: اگر تمہارے باپ بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا خاندان، اور مال ودولت جو تم نے کمایا ہے، اور وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے، اور وہ رہائشی مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے، اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے''۔ امام قرطبیؒ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ: **وفی الآیة دلیل علی وجوب حب اللہ وحب رسوله، ولا خلاف فی ذلک بین الائمة، وان ذلک مقدم علی کل محبوب**۔ (الجامع للقرطبی: 10 / 141) کہ یہ آیت اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے، اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف نہیں ہے، اور یہ محبت ہر محبوب چیز سے مقدم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس معاملہ میں اہم ترین ہدایات دیں اور اپنی محبت کو ہر ایک پر فائق ہونے کو کمال ایمان کی نشانی بتائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **والذی نفسی بیده لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین**۔ (بخاری، حدیث نمبر: 13) ترجمہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کے دل میں اس کے والد، اس کی اولاد، اور دنیا کے تمام لوگوں سے میری محبت زیادہ نہ ہوجائے''۔ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ جارہے تھے، آپ ﷺ حضرت عمر کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، اسی دوران حضرت عمر نے فرمایا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے اپنی جان کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپ سے محبت ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تم کیا کہتے ہو؟ اگر بات ایسی ہی ہے تو تم ابھی کامل ایمان والے نہیں ہوئے، اور نبی کریم ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ: تم پر لازم ہے کہ میری ذات تمہارے نزدیک تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو، اس کے بغیر تمہارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ جب حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد سنا تو کہنے لگے کہ یارسول اللہ! اب آپ کی ذات میری جان سے بھی زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمر تمہارا ایمان اب مکمل ہوا۔ (بخاری، حدیث نمبر: 6170)

مذکورہ بالا ارشادات سے پتہ چلتا ہے محبتِ رسول ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، اور جب تک دل

میں نبی کی محبت نہیں ہوگا، اس کا ایمان کامل ومکمل بھی نہیں ہوگا، اس لئے محبت رسول ﷺ کو دلوں میں زندہ کرنے کی ضرورت ہے، اور ایسی محبت جو واقعی حقیقی ہو اور بے لوث ہو، جس میں کسی قسم کا دکھاوا یا ڈھونگ نہ ہو ایسی محبت سے سینوں کو آباد کرنے اور زندگیوں کو منور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

## سیرتِ رسول ؐ پر عمل کی ضرورت

حقیقی محبت کو جانچنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک آسان طریقہ بتادیا کہ جو کوئی آپ کی سیرت اور سنت کو اپنائے گا وہی حقیقی محبت کرنے والا شمار کیا جائے گا، زبان سے بلند بانگ دعوے ہوں اور زندگی عمل سے خالی اور سیرت وکردار میں نبوی تعلیمات کی جھلک نہ ہو تو وہ محب صادق نہیں قرار دیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی نے ساری انسانیت کے اسوہ اور نمونہ بنا کر بھیجا ہے، اور خود قرآن کریم میں اس کا اعلان فرمایا کہ : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔(الاحزاب: 21) حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ اگر کوئی اللہ تعالی سے محبت کا طلب گار رہے تو اس کو حکم دیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی پیروی کرے چناں چہ ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا (آل عمران :31)۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جو مجھ سے محبت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا (مشکوۃ: حدیث نمبر 175) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے: لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به۔ (شرح السنۃ للبغوی: حدیث نمبر: 103) ترجمہ: ''تم میں سے کوئی (حقیقی) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی ہدایت وتعلیم کے تابع نہ ہوجائے۔''

ماہِ ربیع الاول اپنی آمد کے ساتھ مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے نبی کریم ﷺ نے جن تعلیمات کے ذریعہ دنیا میں انقلاب برپا کیا اور انسانوں کی کایا پلٹی ہر دور اور ہر زمانے میں ہم انہی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر دنیا میں پیارے آقا ﷺ کی حقیقی غلامی کا تصور دے سکتے ہیں۔ دنیا ہر عہد میں انہیں تعلیمات کے ذریعہ چین وسکون پاسکتی ہیں، ہر شعبۂ حیات سے وابستہ انسانوں کی حقیقی کامیابی صرف آپ ﷺ کے لائے ہوئے مبارک دین میں ہے، آپ ﷺ ہی کے دامن مبارک سے وابستہ ہوکر دوجہاں میں سرخرو وکامیاب ہوسکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات کو اللہ تعالی نے ساری انسانیت کے لئے نمونہ اور اسوہ بنایا، صبحِ قیامت تک ہر فردِ بشر آپ ﷺ ہی کے نقشِ قدم کی پیروی میں سربلند ہوسکتا ہے۔ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اٹوٹ وابستگی اور سچی محبت ہی ایمان کامل کی علامت ہے، اور اپنی تمام تر خواہشات ومرضیات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت وتعلیمات پر قربان کرنے کے نتیجہ میں ہی مومنِ کامل بن سکتے ہیں۔

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق صرف یہ نہیں ہے کہ ایک جلسہ سن لیں اور کسی جلسہ کا اہتمام کردیں بلکہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہمیں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنانا پڑے گا، ہمارا عمل اور رہن سہن، معاملات اور معاشرت سے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمایاں ہونا چاہیے، ہماری زبان اور فکر سے اسوۂ حسنہ کی عکاسی ہونا چاہیے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے فرمان کے مطابق مظلوموں کی مدد بھی کرنا اور ظالموں کو ظلم سے روکنے کی تدبیریں بھی کرنا ہوں گی، ہم کوشش کریں کہ ہم دنیا والوں کے سامنے اپنے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی ترجمانی کرنے والے بنیں، ہمارا کوئی عمل اور طریقہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر انگلی اٹھانے والا نہ ہو اور دشمن کو ہمارے دین کا مذاق اڑانے کا موقع نہ ملے، ہمارے سیرت رسول کو اپنانے کے نتیجہ میں دشمنان اسلام اور معاندین نبی کی تمام تر سازشیں اور تحریکیں ناکام ونامراد ہوجائیں گی، اور کبھی ان کو نبی کی شان میں گستاخی یا بے ادبی کرنے کی جسارت نہیں ہوگی۔

## تعلیمات نبوی کو عام کرنے کی ضرورت

ماہِ ربیع الاول کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ساری انسانیت کی بھلائی اور خیر کی تعلیمات لے کر آنے والے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو دنیا کو سامنے اچھے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے، قرآن کریم میں اللہ تعالی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو ساری انسانیت کے رحمت قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا: وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء:107) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ جس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لاتعداد احسانات دنیائے انسانیت پر ہیں، جو ساری انسانیت کی بھلائی کے لئے آیا، جس نے ہر کٹھن مرحلہ پر انسانوں کا ساتھ دیا اور مشکلات سے نکلنے کا نسخہ عطا کیا، جس نے عورتوں کو عزت دی، یتیموں پر دستِ شفقت پھیرا، بیواؤں کو سہارا دیا، غلاموں کو آزادی دلائی، مظلوموں کے لئے آواز اٹھائی، ظالموں کو ظلم سے روکا، دشمنوں کو معاف کیا، پتھر مارنے والوں کو دعائیں دیں، تجارت ومعیشت کے اصول دیئے، خانگی اور خارجی زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتائے، اچھے اور برے کی تمیز کروائی، نفع ونقصان سے آگاہ کیا، امن وانصاف کی تعلیمات دیں، ناحق قتل وخون ریزی سے منع کیا، بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکا، خلوص ومحبت کا سبق سکھایا غرض یہ کہ دین ودنیا کی ہر تعلیم اور ہر ایک کے حق کو بتایا آج ہم نے ایسے عظیم محسن اور ساری انسانیت کے غم خوار نبی کی تعلیمات کو خود بھی چھوڑا اور دوسروں کو بھی دور رکھا!!!! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت عرب وعجم، کالے وگورے، شہری و

دیہاتی، پڑھے لکھے اور جاہل، مالدار وغریب، اپنے اور پیرائے، سب کے لئے ہوئی، آپ ﷺ کی تعلیمات قیامت تک زندہ رہیں گی اور انہیں تعلیمات کی روشنی میں انسانیت کا سفینہ آگے کامیابی کے ساتھ بڑھ پائے گا۔ دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کر لے لیکن اسے آپ ﷺ کی تعلیمات کے سامنے سرنگوں ہونا ہی پڑے گا۔

ماہِ ربیع الاول ہم اہل ایمان سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دنیا والوں کے سامنے پیارے آقا ﷺ کی سیرت کو اچھے انداز میں پیش کریں، آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو عملی طور پر اختیار کر کے بتائیں، اپنے گھرانوں کو سنت کے سانچے میں ڈھالیں، اپنی اولاد کو دینی تربیت سے آراستہ کریں، ان کے دل میں محبت رسول اور اتباعِ سنت کے جذبات کو فروغ دیں، نوجوان اپنا حلیہ اور لباس، وضع قطع کے ذریعہ اور اپنی اداؤں سے سیرت رسول کو زندہ کریں، خواتین میں دینی شعور بیدار کیا جائے، اخلاق وحیا کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور مغربی تہذیب کی نقالی سے ان کو بچایا جائے، گھر کے ماحول کو اسوۂ نبوی کی روشنی میں سنوارا جائے، اور اخلاق وکردار، رحم دلی وشفقت، خیر خواہی اور ہر ایک کی ہمدردی کا مظاہرہ کریں، گہری بصیرت اور حکمت سے آراستہ ہو کر اصلاح اور انقلاب کی کوشش کریں۔

## ایذا رسانی سے اجتناب کی ضرورت

ماہِ ربیع الاول چوں کہ پیارے آقا حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ولادت باسعادت کا مہینہ ہے، اس کی مناسبت سے ہر کوئی دینی جلسے اور اجتماعات منعقد کرتا ہے، سیرت رسول ﷺ سے آگہی کے لئے اور آپ کی عقیدت ومحبت میں ربیع الاول میں ان کا بڑا اہتمام میں کیا جاتا ہے، ولادت نبوی ﷺ اور آپ ﷺ کی آمد کے ذکر خیر کے چرچے اور تذکرے ہوتے ہیں، اور یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ہمارے لاتعداد جلسے اور اجتماعات، مقالے اور کتابیں، تقاریر اور مواعظ سب مل کر بھی اس موضوع کا حق ادا نہیں کر سکتے، یہ تو ہماری سعادت اور خوش بختی ہے کہ ہمیں ان کے ذکر خیر کا موقع کا نصیب ہو جائے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ آپ ﷺ جو دین لے کر مبعوث ہوئے وہ دینِ رحمت ہے، جس میں ساری انسانیت کے لئے امن وعافیت کا پیغام ہے، اسلام کے سایہ میں نہ صرف انسانوں کو آرام وسکون نصیب ہوا بلکہ جانور بھی اسلام کے سایہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون ہو گئے، کیوں کہ اسلام نے پورے اہتمام کے ساتھ ہر طرح کی ایذا رسانی پر نہ صرف پابندی لگا دی بلکہ کسی کو بھی تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا، اور کمال ایمان کی علامت یہ بتائی کہ زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانی سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔ **المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔** (بخاری: حدیث 9)

لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے کسی جلسہ یا یا پروگرام سے کسی کو بھی زبان و ہاتھ اور گفتگو سے اذیت نہیں ہونا چاہیے، ہم سیرت رسول ﷺ کو تعلیمات رسول ﷺ کی روشنی میں انسانوں کے سامنے پیش کرنے والے بنیں۔ جو نبی ﷺ انسانوں کو راحت پہونچانے اور رحمت کا عام پیغام لے کر آئے، اور جو ہر ایک کی راحت رسانی کے لئے ہر دم کوشاں رہتے اس محسن نبی کا نام لے کر ہم لوگوں کے لئے پریشانی اور اذیت کا سبب نہ بنیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک مقرر حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے سامنے زور زور سے تقریر کر رہا تھا تو آپؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس شکایت بھیجی کہ اس کی بلند آواز سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے اور کسی کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی، امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے پہلے اس کی تنبیہ فرمائی جب وہ اس سے باز نہیں آیا تو پھر اس کو سزا دی۔ (تاریخ المدینہ لابن شبہ: 1/ 15)

اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے دینی اجتماعات بھی اسلام کا پیغام پھیلانے کا ذریعہ بنیں اور سیرت رسول کا آفاقی پیام انسانوں تک پہنچ سکے اور ہر اس عمل اور کام سے اجتناب ضروری ہے جو پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو بدنام کرنے سبب ہو۔ بلاشبہ یہ بھی ایک دینی تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کے پیغام کو اور آپ ﷺ کے مقصد بعثت کو دنیا تک پہنچایا جائے اور مختلف جلسوں اور اجتماعات کے ذریعہ اس کو عام کیا جائے لیکن اس کے لئے طریقہ بھی وہی ہونا ضروری ہے جس سے آپ ﷺ کی تعلیمات پر کسی قسم کی بھی زد نہ پڑے اور ہمارے کام غیروں کو اسلام سے بدظن کرنے سبب نہ ہو۔

## گونگے صفحات کو گویائی عطا کرنے والا ایک عظیم فنکار

# مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

مولانا فاروق اعظم قاسمی

ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، اور علامہ شبلی مرحوم اپنے فکر وفن، سخن شناسی، تنقید وتحقیق اور شاعری میں تاریخی وتعمیری کارناموں کے حوالہ سے جس طرح وہ اردو ادب میں عناصر اربعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح دیوبند کے علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی افق پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے والوں میں چار نام انتہائی روشن وتابندہ ہیں جنہیں دنیا علامہ صابری، عامر عثمانی، جمیل مہدی اور ازہر شاہ قیصر مرحوم کے نام سے جانتی ہے، انہوں نے زبان وقلم سے دیوبند کے علمی، دینی، فکری، ادبی اور سیاسی منارے سے کم وبیش چالیس سال تک اذان دی ہے۔ اس اذان نے بہت سے بے راہوں کو راہ اور راہ گیروں کو منزل کا پتہ بتایا، ان فنکاروں نے اپنے فن پاروں، خداداد صلاحیتوں اور زبردست جدوجہد کے ذریعہ اردو زبان کو حسن کی دوشیزگی عطا کی، ان کے کارنامے تاریخ ادب اردو کا ایک باب اور اس زبان سے ان کی محبت وخلوص اردو کا سرمایہ ہے، یہاں آخر الذکر شخصیت کی ادبی گلکاریوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا، بطور خاص انہوں نے الفاظ کے رنگے برنگے پھولوں اور اچھوتے اسلوب واداب کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے شخصیت نگاری کے جو گیسو سنوارے ہیں ان کو سپردِ قرطاس کیا جائے گا۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم نے ۶۷ رسال کی عمر پائی، ۹ رسال کی سنِ غیر شعوری ہی میں قلمی سفر کا آغاز کیا اور اپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک اردو اصناف کی مختلف وادیوں میں ۵۸ رسال تک سیر کرتے رہے ہیں، انہوں نے دسیوں رسائل واخبارات کی ادارت کی اور ملک وبیرون ملک کے ۸۷ راخبار ورسائل کے ہزاروں صفحات پر مشتمل اردو کو ساڑھے چار ہزار وقیع مضامین کا عظیم سرمایہ عطا کر کے اس زبان کے قد کو بلند کیا۔ درجنوں اہلِ سخن اور زبان شناس وفنکار مولانا مرحوم کے حلقۂ ارباب میں رہے، بہت سے اساتذۂ فن نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کر کے داد وتحسین سے نوازا اور متعدد اردو کے بلند پایہ قلم کار اور

مصنفین ان کی زیر تربیت تیار ہوئے جن کی آج حلقۂ ادب میں ایک شناخت اور پہچان ہے۔

شاہ جی مرحوم گونا گوں اوصاف وکمالات کے حامل ایک عظیم انسان تھے، لیکن ان کی اصل شناخت ایک قلم کار کی حیثیت سے ہوئی، انہوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے خامہ عنبر شمامہ نے جہاں نثر کی زلفوں کو خوبصورت انداز میں سنوارا، وہیں شاعری کو بھی عمدہ فکر کا لباس عطا کیا، لیکن شاعری کے مقابلہ ان کا نثری سفر خاصا طویل ہے اور گلستانِ نثر میں بھی بالخصوص خاکہ نگاری وشخصیت نگاری اور بقول مولانا اسلم قاسمی صاحب تاثر نگاری کے ایسے پھول کھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے رنگ آنکھوں کو بھائے اور ان کی خوشبو ذہن ودماغ کو تازہ کردے۔ اور اس ایک صنف کی حیثیت بھی اس شش جہت ہیرے کی مانند ہوتی ہے کہ مولانا مرحوم کے فن کے کئی پہلو نگاہوں کے سامنے جھلملانے لگتے ہیں۔

الفاظ کا بناؤ سنگار، اسلوب وادا کا بانکپن، فکر کی پختگی اور لہجے کی شگفتگی ان کے قلم کی پہچان ہے، حسن وجمال کے انیک رنگوں سے جب وہ کسی کا عکس جمیل اتارتے ہیں تو مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب کا وہ قول قلم کی نوک پر آنے کے لئے بے تاب ہونے لگتا ہے کہ:

’’سچی تصویریں بنانے اور گونگے صفحات کو گویائی بخشنے کا فن ان کو آتا تھا‘‘ (جانے پہچانے لوگ: ص ۷۴)

از ہر شاہ قیصر مرحوم کو اپنے اسلاف سے بڑی عقیدت تھی اور اس عقیدت میں تقلید کم اور مشاہدہ وتجربہ زیادہ کارفرما ہوتا تھا، اس کے اظہار کے بعد ایک جگہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’میں اپنی ان واردات قلبی کے اظہار پر مجبور ہوں کہ مولانا گیلانیؒ کا تصور میرے لیے لذت بخش، ان کی تحریریں میری فکری الجھنوں کا ایک حل اور ان کی شخصیت میرے خزینۂ محبت کی متاعِ عزیز ہے‘‘ (یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: ص ۵۶)

وہ ناقابلِ فراموش شخصیات کو فن کے آئینے میں کس طرح اتارتے ہیں مولانا شاہین جمالی کی تحریر میں یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ:

’’ہم اس حقیقت کے اظہار میں تامل مناسب نہیں سمجھتے کہ شاہ صاحب کے نکتہ رس اور فن شناس قلم نے بیتے لمحوں اور ماضی کی بھولی بسری مگر ناقابل فراموش شخصیتوں کا عکس فن کے شیشے میں اس طرح اتارلیا ہے کہ بقول جگر مرحوم؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

کا منظر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے‘‘ (یادگارِ زمانہ...: ص ۱۰)

شاہ جی مرحوم اپنے متوازن انداز اور اچھوتے اسلوب میں جب کسی صنف پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا

حق ادا کر دیتے ہیں، مولانا انظر شاہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

''عنوانات علمی ہوں یا ادبی، شخصیت نگاری ہو یا تاریخ کا کوئی اچھوتا واقعہ، وہی بانکپن، وہی سحر نگاری، وہی لطیف مرقع، وہی جچی تلی بات، وہی متوازن انداز، وہی موزوں ومناسب طرز ادا'' (مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ایک ادیب، ایک صحافی: ص ۱۳)

اردو شاعری کے حوالے سے اگر الفاظ کی دنیا بسانے میں سب سے نمایاں کردار جوش اوراس کے بعد احسان دانش کا ہے تو نثر میں پوری کامیابی کے ساتھ اسی سلسلے کو آگے بڑھانے میں شاہ جی کا بڑا کارنامہ رہا ہے۔اشرف عثمانی اسی حقیقت کو یوں واشگاف کرتے نظر آتے ہیں کہ:

''شاہ جی کے یہاں الفاظ کے جمالی پیکر شجر ممنوعہ نہیں تھے، چوں کہ وہ بخوبی واقف تھے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے'' (...ایک ادیب، ایک صحافی ص ۱۲۷)

آگے لکھتے ہیں:

''دلفریب ترکیب اور اسلوب وابلاغ کا جمالیاتی اظہار ایک زبردست ہم آہنگی کے ساتھ شاہ جی کی تحریروں میں رچا بسا نظر آتے ہیں'' (ایضاً)

شاہ جی نے کشمیر کے سلسلے میں الفاظ کا جو پیکر تراشا ہے گویا اس جنتِ ارضی کا ایک ایک ذرہ اپنا تعارف خود کرا رہا تھا وہ لکھتے ہیں:

''ہر ذرہ حسنِ فطرت کا ایک دل آویز شاہکار ہے، زمین کے سینے پر مچل مچل کر چلتے اور بہتے سرد وشیریں چشمے، دراز قد اور سڈول جسم محبوبوں اور نازنینوں کی طرح تن کر کھڑے ہوئے چنار کے درخت، شرابِ جوانی کی تندی اور مستی میں بہک بہک کر جھومتے رہنے والے سیب اور خوبانی کے پیڑ، آسمان کی بلندیوں کو بار بار چھوتی رہنے والی پہاڑیوں، حدنظر تک پھیلی ہوئی سبزۂ ولالہ وشگوفوں کی چادریں، قدرتی چشموں، بلند آہنگ آبشاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہوئے دریاؤں کے کنارے پر بیٹھی ہوئی حسین دوشیزاؤں کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نیک دلی کی معصومیت، ان کی پیشانیوں کی چاندنی، زلفوں میں بسی ہوئی نکہت، گیسوئے عنبری میں پڑے ہوئے شکن اوران کے شبابِ تازہ وجمالِ کامل کی مسکراتی ہوئی بہار، پھولوں، پھلوں اور میووں کی فراوانی، موسم کی خوشگواری، زمین کی قوت نمو، ہوا کی تازگی اور لطافت، پانی کی ٹھنڈک اور غذا کی خوش ذائقی اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی''۔ (یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، ص: ۲۰)

ان کے قلم کی خوشبو سے اردو کی مختلف اصناف معطر ہوئیں، لیکن شخصیت نگاری اور حلیہ تراشی ان کے قلم

کی خاص پہچان بنی، وہ اپنے جاندار اسلوب سے بے جان اوراق میں زندگی کی لہر دوڑ انے کا ہنر جانتے تھے اوران کے قلم کے زمزم سے مرجھائے ہوئے پھولوں کو تازگی مل جاتی تھی، وہ پیکر تراشی کیا بولتی تصویر تیار کرتے تھے۔ان کی تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا لکھنے والے کا ممدوح قاری سے ہم کلام ہے۔ مولانا قمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''ہر تصویر کوان کے سحر طراز قلم نے پیکر محرک بنادیا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کے ممدوح ہمارے سامنے ہیں اوراپنے علمی وفنی کمالات کے ساتھ محوِ گفتگو ہیں''(....ایک ادیب ایک صحافی:ص ۵۸)

مولانا ازہر شاہ قیصر فطری طور پرایک کامیاب حلیہ نگار تھے، جب وہ کسی صاحب فن وکمال کا سر پا سپردِ قرطاس کرتے ہیں تو اس کے تمام خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، چنانچہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے علمی کمالات وخصوصیات کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

''ہمارے مخدوم ومحترم صاحب المعالی والمناقب حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ صاحب اس جماعت (دیوبند) کے ایک ممتاز فرزند ہیں۔حضرت مولانا اپنی تصانیف، بے شمار علمی خدمات، تدریسی خصوصیات، اعتدالِ فکر، پاکیزگئ مذاق اور علوم حدیث وقرآن اوران سے متعلقہ مضامین کے علاوہ عصری معلومات اور دورِ حاضر کی علمی تحقیقات کے ایک نامور سرمایہ دار اور مسلم الثبوت استاذ ہونے کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں''۔(یادگارِ زمانہ....ص:۴۲)

جس طرح خوب صورت پیرائے میں انہیں کلی تفصیلات کے ساتھ منظر کشی کا ہنر آتا ہے اسی طرح جزوی تفصیلات کی عکاسی پر بھی وہ مکمل قدرت رکھتے ہیں، چنانچہ مولانا گیلانیؒ کی البیلی خطابت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

''جس طرح بہار، موسم کی خوشگواری، شجرہ وثمر کی ایک نئی زندگی، بادِ شمال کی مستانہ روی اور غنچہ وگل، لالۂ ونرگس اورنسرین ونسترن کے فلک شگاف قہقہوں کا ایک دوسرا نام ہے اسی طرح مولانا مناظر احسنؒ کی تقریر، لب ولہجہ کی مٹھاس، الفاظ کی صحیح نشست وبرخاست، مضامین کی آمد، معلومات کی وسعت اوراسلوب وانداز کی جدت وندرت کی جامع ہے''(یادگارِ زمانہ....ص:۷۴)

ایسے ہی ایک جگہ مولانا گیلانی مرحوم کی تدریسی خدمات کو استعارات وکنایات کا خوبصورت جامہ یوں پہناتے ہیں کہ:

''حیدرآباد میں حضرت مولانا مناظر احسنؒ کی درسی خدمات گذشتہ حیدرآباد کی علمی زندگی کی ایک شاندار علامت تھی، جس طرح بغداد وغرناطہ اور قرطبہ وقاہرہ میں اسلامی خلافتوں اور حکومتوں کے زریں عہد میں دنیا کے

بڑے بڑے علمائے دین کھنچ کھنچ کر وہاں پہنچ گئے تھے اور ان کی درس گاہوں سے علم وفن کے چشمے ابل رہے تھے۔ اسی طرح حیدر آباد کو اپنے وقت کا بغداد سمجھئے اور مولانا احسن گیلانیؒ کو اس گہوارۂ علمی کا امام الحرمین یا امام غزالیؒ ''(یادگار زمانہ....ص:۴۶)

مولانا مرحوم کو اس فن میں کیسی مہارت تھی اس کا ایک اور نمونہ پیش ہے:

''وہ ایک روحِ دل نواز، ایک پیکرِ حسن ومحبوبی، ستاروں کی تنگ تابی اور شبِ ماہ کا ایک کیف جاوداں، ایک موجۂ نسیم وصباء، ایک نکہتِ گل، ایک صبح باراں، ایک گل لالہ، ایک شعلۂ خرمن سوز، ایک شیرازۂ آتش افروز، رونقِ چمن، چراغِ انجمن، یثرب وبطحا کی ایک مقدس آواز، وادیٔ عرفات اور جبل احد کا ایک نعرۂ فلک نما، گنگا کی عظمت اور دریائے چمن کا بانکپن، قرآن کا اعلانِ حق اور وطنی وفاداری کا ایک نشانِ راہ، وہ وضع داری، شرافت اور مروّت کا ایک دریا، جرأت وجذبۂ حق گوئی کا ایک پہاڑ، تہذیب وانسانیت کی ایک دیوار چین اور زندگی کی بنیادی سچائیوں کا ایک تاج محل، علوم شریعت کا ایک خزینہ اور عصری سیاست کا ایک رہنما جس نے سالہا سال مردوں میں کھڑے ہوکر اذان دی۔''(یادگارِ زمانہ...ص۵۰)

مزید لکھتے ہیں کہ:

''جس شعلہ بیانی، شعلہ نفسی اور شعلہ نوائی سے حضرت عمر فاروقؓ کے جلالِ ایمانی کا چراغ روشن اور جس کی فصاحت وبلاغت حضرت علیؓ کی سحر بیانی کے مشابہ، جس نے اپنے علم وتحقیق سے اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے وہبی علوم کی یاد تازہ کی اور جس نے اپنے جوش مجاہدانہ اور جذبۂ فداکارانہ سے اپنے استاد الاساتذہ مولانا محمود حسنؒ کی روحِ ایمانی کو زندہ کیا، ساری دنیا انہیں مولانا حفظ الرحمن کہتی ہے''۔(ایضاً:ص:۵۰،۵۱)

آخر میں لکھتے ہیں:

''حفظ الرحمن ایک شخص نہیں ہے ایک تاریخ ہے، ایثار واستقلال کا ایک افسانہ ہے، جرأت وشجاعت کا ایک دور ہے، اور حرکت وعمل کا ایک نمونہ ہے''۔(ایضاً،ص:۵۱)

شاہ جی جب شاہ (عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) کی لفظی تصویر بنانے پہ آتے ہیں تو قلم کی دنیا میں ''دوشاہا'' جوار بھاٹا آجاتا ہے اور الفاظ کی اسکرین پر ایک عظیم انسان چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے، منظرنامہ یوں شروع ہوتا ہے:

''جب قدرت نے خود ادارہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور، طوفانوں کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی، بادلوں کی گرج، درختوں کی بلندی، صحرا کی وسعت، صبح کی بہار آفرینی، شام کی رعنائی، راتوں کے سکون،

پھولوں کی لطافت، کلیوں کی نزاکت، بادِصبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس کا نام رکھا''(یادگارِ زمانہ...ص:۷۸)

شاہ جی کا طوفانی قلم احسان دانش کے شاعرانہ جغرافیہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ آئینہ کے ساتھ ساتھ آئینہ ساز کی استاذانہ مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''احسان کی شاعری نہ جوش کی شاعری کی طرح ثقیل ہے نہ سیماب کی طرح بہت حد تک بے روح اور کثرتِ مشق کی آئینہ دار ہے، نہ ظفر علی خاں کی طرح بے رنگ و بو، پٹھانوں کی طرح سخت اور نہ علماء کرام کے مواعظ کی طرح خشک اور نہ ساغر کی شاعری کی طرح خامکارانہ اور ابتدائے عمر کے گلی کوچوں میں آوارہ و ناکارہ؛ بلکہ ان سب سے جدا اس کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے، جس میں ادب، نغمہ، حقیقت، اثر، صداقت، فکر و عمل کی پختگی اور استاذانہ مہارت کی شان امتیازی بدرجۂ اتم موجود ہے''(یادگارِ زمانہ...ص:۹۴،۹۰)

مذکورہ جھلکیوں سے جہاں مولانا مرحوم کی فنی حذاقت کی گواہی ملتی ہے وہیں مولانا ازہر شاہ قیصر مرحوم کی تنقیدی جہت اور زبان پر مکمل قدرت کا بھی سراغ ملتا ہے۔ آج چند نام نہاد زبان شناس مولوی نما فنکاروں کی استاذانہ مہارت کو لاکھ نظر انداز کریں تاریخ انہیں فراموش نہیں کرسکتی؛ اس لیے کہ تاریخ خود بنتی ہے، بنائی نہیں جاتی۔

آج ضرورت ہے کہ نئی نسل ایسے پرانے چراغوں سے روشنی حاصل کر کے اپنے مستقبل کو روشن و تابناک بنائے۔ مولانا ازہر شاہ قیصر مرحوم کے آثار علمیہ پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ایک طرف جہاں اردو داں طبقہ پر ان کا حق اور ان کے کاندھے پر شاہ جی کا علمی قرض ہے، وہیں ان کے تربیت یافتہ اور جانشینوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کلیات کی شکل میں ان کی تمام تحریریں اہل ادب و ذوق کے سامنے آسکیں تاکہ نسل نو ان کی خدمات سے پوری طرح باخبر ہوسکے۔ ماشاء اللہ ان کے حقیقی جانشین مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب اس سلسلے میں متحرک ہیں اور گذشتہ برسوں میں انہو ں نے ازہر شاہ قیصر پر کئی علمی و تحقیقی مضامین قلم بند کئے ہیں اور ان کے مضامین سے منتخب شدہ مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے جو طباعت کے لئے تیار ہے۔ خدا انہیں سفر کے تمام توشوں کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچائے۔ آمین!

۞۞۞

# برقی ادب اور مطبوعہ ادب: ایک تقابلی جائزہ

نایاب حسن قاسمی

اکیسویں صدی کے آغاز سے کچھ دنوں پہلے ادب وتخلیق کی ایک نئی صورت ظہور پذیر ہوئی، جسے ڈیجیٹل ادب، الیکٹرانک ادب یا برقی ادب کے نام سے جانا جاتا ہے، قبل اس کے اس کی حقیقت و ماہیت اور نوعیت وحیثیت پر گفتگو کے دروازے کھولے جاتے، دنیا نے دیکھا کہ اس نے نئی نسل کے ایک بڑے حصے کو اپنے آغوش میں لے لیا، نئی نسل ہی نہیں، پرانی نسل کے تیز طرار بندے بھی اس سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے اور انھوں نے بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے برملا اظہار کے لیے برقی لہروں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ جب کمپیوٹر اور اس کے بعد انٹرنیٹ کا ظہور ہوا، تب لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ ان ایجادات کا دخل انسانی زندگی کے مختلف علمی وادبی شعبوں کو اتنا زیادہ محیط ہوگا، جتنا کہ اب ہم اپنی چشمِ سر سے دیکھ رہے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ تخلیقات، کتابوں اور تصانیف کے قارئین روز بروز گھٹتے جا رہے ہیں، جبکہ ڈیجیٹل اسپیس میں آداب وتخلیقات کی رسائی مختلف تنوعات اور خصوصیات کے ساتھ ہو رہی ہے۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کے شعبے میں دن بدن رونما ہونے والی ترقیات اور دانش مند طبقوں میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے اب باقاعدہ ڈیجیٹل ادب اور کتابی (مطبوعہ) ادب پر تحقیق، مباحثے اور مطالعات ہو رہے ہیں، حتی کہ اب قاری بھی دو دھڑوں میں منقسم ہو چکے ہیں، ایک وہ جو مطبوعہ ادب پڑھتا ہے اور دوسرا وہ، جو برقی ادب پڑھتا ہے۔ اِس وقت عالمی سطح پر گوگل اور فیس بک، واٹس ایپ، ٹوئٹر، انسٹاگرام، اسنیپ چیٹ وغیرہ جیسی سماجی رابطوں کی سائٹس کے ذریعے نشر کی جانے والی تحریروں پر نہ صرف بحث مباحثے ہو رہے ہیں؛ بلکہ بعض ممالک (جیسے ہندو پاک) میں انھی تحریروں کی بنیاد پر بہت سے حکومتی وغیر حکومتی فیصلے اور اقدامات بھی عمل میں آ رہے ہیں، شاید اسی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کی ممتاز تعلیم گاہ دہلی یونیورسٹی نے انگلش آنرس میں ایک مضمون کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس میں سوشل میڈیا کو برتنے کے اصول وضوابط سے آگاہ کیا جائے گا۔

ڈیجیٹل ادب کے عام رواج اور سوشل میڈیا کے ذریعے اس کی رسائی کے بڑھتے ہوئے دائرے

کے پیشِ نظر اب باعدہ ڈیجیٹل ادب اور مطبوعہ ادب کے مابین موازنہ ومقارنہ کا عمل بھی شروع ہو چکا ہے اور اہلِ ادب میں دو ایسے گروہ بن چکے ہیں جن میں سے ایک کا موقف یہ ہے کہ ڈیجیٹل ادب اپنے دائرۂ اثر، رسائی اور افادیت کے اعتبار سے مطبوعہ ادب پر فوقیت رکھتا ہے، جبکہ ایک دوسرا گروہ مطبوعہ ادب کی افادیت ومعنویت پر مصر ہے؛ حالاں کہ ایک تیسرا طبقہ بھی ہے، جس کا ماننا ہے کہ دونوں طرح کی تخلیقات کو ایک دوسرے کا حریف اور مدِ مقابل سمجھنے کی بجائے ادب کے پھیلاؤ اور ترسیل واشاعت میں معاون کے طور پر دیکھنا چاہیے، اس سے فی نفسہ ادب کی ترویج اور اسے نئی نسل تک پہنچانے میں سہولت بھی ہوگی اور ادب کو اس سے فائدہ بھی ہوگا۔ البتہ اس موضوع پر تقابلی بحث کے محوری نکات کا مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

## ڈیجیٹل ادب: خصوصیات کیا ہیں؟

اگر کوئی شخص تحریری شکل میں اپنی تخلیقات اور خیالات وافکار کو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے، تو اس کے لیے کئی چیزیں ضروری ہیں ،مثلاً یہ کہ اسے کوئی ایسا اشاعتی ادارہ میسر آجائے جو اس کی کتاب رتحریر رمضمون رافسانوی یا غیر افسانوی تخلیق کی اشاعت کا بار اٹھانے کی ذمے داری لے لے، کسی رسالے یا اخبار میں اسے ایڈیٹری یا لکھنے کا موقع مل جائے، پھر اسے ایسے نقاد میسر آجائیں، جو اس کی تحریروں کی صحیح قدر و قیمت کا ادراک کرسکیں اور قارئین کو ان کے مطالعے کی ترغیب دے سکیں؛ آج کے دور میں ان مراحل کا طے ہونا کتنا مشکل کام ہے، اس سے ہر وہ شخص واقف ہوگا، جو اس شعبے سے آگاہ ہے یا اسے ان مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ آج کل کسی نئے یا نسبتاً گم نام مصنف کو کوئی اچھا اشاعتی ادارہ مل جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے؛ کیوں کہ اب کام نہیں برانڈ اور ٹھپوں کا دور ہے، کتنے ہی ایسے لوگ بڑے قابلِ قدر مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، جن کی کتابیں گوشۂ گمنامی میں رہتے ہوئے کوئی دوسرا شخص لکھتا ہے، ان بے چاروں کو تو بہت سے الفاظ کے صحیح تلفظ تک کا علم نہیں ہوتا، مگر کیا کیجیے کہ ایسے ہی لوگ دانش وروں اور اربابِ علم کی پہلی صفوں میں براجمان ہوتے ہیں اور جو واقعتاً صاحبِ علم و دانش ہوتا ہے، اسے آخری صف میں بھی بمشکل ہی جگہ مل پاتی ہے، پھر یہ کہ اگر آپ کی کتاب چھپ بھی گئی، تو اسے کہاں تک پہنچا سکتے ہیں ،مثال کے طور پر چند شہروں میں یا پورے ملک کے ہزار دو ہزار یا کچھ اور زیادہ لوگوں تک؛ لیکن اس کے برعکس ڈیجیٹل اسپیس پر ہمہ وقت صلائے عام کی سی کیفیت ہوتی ہے، کوئی بھی شخص، جو اپنے خیالات رکھتا ہے اور ان خیالات کے اظہار کی بھی خواہش رکھتا ہے، وہ بلا کسی روک ٹوک کے گوگل، فیس بک، ٹوئٹر، واٹس ایپ، انسٹا گرام وغیرہ جیسی پچاسوں سائٹوں کو وسیلۂ اظہار بنا سکتا ہے، نہ اسے کسی اشاعتی

ادارے کی ضرورت ہوگی، نہ بہت زیادہ پیسوں کی، نہ کسی نقاد کی اور نہ اپنی تعریف کے لیے لوگوں سے منت سماجت کرنے کی، یہاں تو بغیر کہے اور درخواست کیے ہوئے ہی اس کی تخلیقات بہ یک وقت سیکڑوں؛ بلکہ ہزاروں لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں اور ان پر اظہارِ خیال بھی دھڑا دھڑ ہوسکتا ہے، لوگ اُسے بھلے ہی نہ جانتے ہوں؛ لیکن اگر اس کی تخلیق میں بقا و نمو کے عناصر پائے جاتے ہیں، اگر اس کی فکر میں روشنی اور خیال میں اچھوتا پن ہے، تو خود بہ خود اس کی پذیرائی ہوگی، لوگ اسے پڑھیں گے بھی، پسند بھی کریں گے اور آگے بھی بڑھاتے جائیں گے۔

اسی طرح اس کے خیال وفکر میں اگر کوئی خامی ہے، تو اس پر بھی بے دریغ اور برملا ردِ عمل سامنے آئے گا اور اس کی روشنی میں تخلیق کار اپنی تخلیق کے معیار کو بلند کرنے کی تگ و دو کرسکتا ہے۔ خاص طور سے نئے تخلیق کاروں کا مطبوعہ ادبی حلقے میں بار پانا بڑا مشکل ہوتا ہے، انھیں اشاعتی ادارہ تو دور، کوئی ایسا بڑا فن کار تک بمشکل میسر آتا ہے، جو اس کے ذوقِ ادب و تحقیق کو مہمیز ہی کرنے میں دلچسپی لے، الٹا وہ اس کی حوصلہ شکنی کے بہانے تراشتا رہتا ہے، ایسے نئے لکھاریوں کے لیے ڈیجیٹل دنیا ایک کھلے اور کشادہ جولان گاہ کا کام کرتی ہے، وہ اپنی تحریریں، اپنے افکار و خیالات مکمل شرح و بسط کے ساتھ نہ صرف پھیلا سکتا ہے؛ بلکہ جہاں چاہے، وہاں پہنچا بھی سکتا ہے اور اسے اس کے بہتر نتائج بھی حاصل ہوں گے، ہمارے عہد میں بے شمار ایسے مرد و خواتین شاعر و نثر نگار پیدا ہو چکے ہیں، جن کا تخلیقی سفر سوشل میڈیا سے شروع ہوا، وہیں سے ان کو شہرت ملی، پھر اشاعتی اداروں نے خود ان کی تخلیقات چھاپنا شروع کردیں اور اب وہ کامیاب تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

## ڈیجیٹل ادب کے مؤیدین

جو لوگ ڈیجیٹل ادب کی تائید کرتے ہیں، ان کی اپنی دلیلیں ہیں، مثلاً:

(ا) کتاب پڑھنے والا انسان ناشر، مصنف، مؤلف اور کتاب کے تابع ہوتا ہے۔ اگر وہ مطالعے کا شوقین ہے؛ لیکن اس کے پاس ایک ہی کتاب ہے، جو اس کے ذوق و پسند سے میل نہیں رکھتی، تو بھی وقت گزاری کے لیے ہی سہی، اسے وہی ناپسندیدہ کتاب پڑھنا پڑے گی، جبکہ اس کے برخلاف ڈیجیٹل ادب کا قاری خود مختار و آزاد ہوتا ہے، اس نے مثلاً ایک تخلیق کار کی تحریر پڑھنا شروع کی، دو چار سطریں پڑھنے کے بعد اگر اسے محسوس ہو کہ تحریر مزے دار نہیں ہے، تو وہ فوراً آگے بڑھ سکتا ہے، سیکنڈوں میں اس کے سامنے کسی دوسرے رائٹر کی تحریر موجود ہوگی، جسے وہ بآسانی پڑھ سکتا ہے، پھر اسے پڑھنے کی کسی ایک شکل کا پابند بھی ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی، چاہے تو ای بک کھول کر کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل وغیرہ کی سکرین

پر پڑھے اور اگر اسے دیکھ کر پڑھنے میں کچھ پرابلم ہے، تو آڈیو بُک کی سہولت بھی ہم دست ہے اور وہ اپنے پسندیدہ مصنف کی کتاب یا تحریر بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے یا چلتے پھرتے بآسانی سن سکتا ہے۔ انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں آڈیو بکس باقاعدگی کے ساتھ رواج پا چکی ہیں، اردو میں بھی بعض ادارے اور افراد اس سلسلے میں دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور کئی مشہور ادبا کی مشہور تحریریں اور ان کی تصانیف آڈیو بکس میں منتقل کی جا چکی ہیں۔

(۲) اسی طرح اگر آپ کتاب پڑھ رہے ہیں تو آپ کو بعض مخصوص ہیئتوں کا پابند ہونا پڑے گا، یا تو بیٹھ کر پڑھیے یا لیٹ کر بھی پڑھنا ہے، تو اس طرح لیٹیے کہ کتاب آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے، پھر اس وقت آپ کو بار بار کروٹیں بدلنا پڑیں گی، سیدھے لیٹ کر بھی زیادہ دیر تک نہیں پڑھ سکتے، پھر جلد ہی تھکاوٹ کا بھی احساس پیدا ہوگا اور پچاس، سو صفحات پڑھنے کے بعد ہی آپ نیند کی آغوش میں ہوں گے، اس کے برخلاف ڈیجیٹل تحریر پڑھنے میں کسی مخصوص وضع کی ضرورت ہی نہیں ہے، آپ جیسے اور جس طرح سے چاہیں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔

(۳) ایک اہم ؛ بلکہ اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر آپ کتاب پڑھنے کے شوقین ہیں، تو اس وقت آپ کو بڑی کوفت اور ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب آپ کے کسی پسندیدہ مصنف کی کوئی کتاب چھپی ہو؛ لیکن وہ آپ کی دسترس سے باہر ہو، مثلاً آپ کے ملک میں دستیاب نہ ہو، تو آج کے تیز رفتار دور میں بھی عام انسان کے لیے ایسی کتاب کا حصول کتنا دشوار ہے، یہ ہم آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ خاص طور پر انڈیا اور پاکستان والے تو اس درد کو بری طرح جھیلتے ہیں آپ اگر ہندوستانی ہیں اور کسی پاکستانی مصنف کو پڑھنا چاہتے ہیں، تو پاکستان سے کتاب منگوانا نہایت مشکل ہے، یہی حال بے چارے پاکستانیوں کا ہے کہ وہ بہت سے ہندوستانی مصنفین کو پڑھنا چاہتے ہیں، مگر کتاب حاصل کریں تو کیسے کریں، سیاست نے دونوں ملکوں کے عوام اور علم دوست طبقوں کی ایسی تیسی کر رکھی ہے۔ ہمارے یہاں دہلی میں عالمی کتاب میلے کے دوران جو دو ایک پاکستانی بک اسٹال لگتے ہیں، وہاں اگر آپ کتاب خریدنے کی نیت سے چلے جائیں، تو قیمت سن کر حیران و ششدر رہ جائیں گے، دو سو صفحے کی کتاب چار سو روپے کی اور چار سو صفحے کی کتاب سیدھے ہزار روپے کی، ٹھیک یہی حال اُن ہندوستانی کتابوں کی قیمتوں کا بھی ہوتا ہے، جو پاکستان کے کتاب میلوں میں پہنچتی ہیں، پتا نہیں ایسا کیوں کیا جاتا ہے، حالاں کہ وہی کتابیں اندرونِ ملک عام طور پر کم اور مناسب قیمتوں میں دستیاب ہوتی ہیں، شاید نقل و حمل اور کسٹم وغیرہ پر خرچ ہونے والے پیسوں کا حساب بھی ان اضافی قیمتوں کے ذریعے وصول کیا جاتا ہے۔ ایسی سنگین

اور نا گفتہ بہ صورتِ حال کے بالمقابل آپ انٹرنیٹ پر آیئے،تو یہاں ایسی سیکڑوں سائٹس ملیں گی، جہاں بڑی چھوٹی لائبریریوں کی ایک لمبی فہرست ہوگی، یہاں اپنی پسند کی تمام کتابوں کے علاوہ متنوع موضوعات پر مشتمل رسائل،ان کے خصوصی شمارے بھی دستیاب ہوں گے،آپ پڑھیے اور استفادہ کیجیے،اتنا ہی نہیں انٹرنیٹ اور''علامہ'' گوگل کے یہاں تو بسااوقات بعض ایسی کتابیں بھی مل جائیں گی،جن کے مطبوعہ نسخے ختم ہو چکے ہیں اور کہیں دستیاب نہیں ہیں۔

(۴)اسی طرح اگر آپ عام قاری ہیں اور کسی مصنف کی کتاب آپ کے سامنے ہے، پڑھنا شروع کیا، کچھ ایسی باتیں نظر آئیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں یا ان سے آپ کو اختلاف ہے،تو آپ فوری طور پر اپنے اختلاف کا اظہار صاحبِ کتاب سے نہیں کر سکتے، نہ ان سے توضیح طلب کر سکتے ہیں اور نہ متعلقہ موضوع پر اسے آپ اپنی رائے سے باخبر کر سکتے ہیں،اس کے برخلاف مثال کے طور پر فیس بک کے کسی پیج پر آپ نے کسی کی کوئی تحریر دیکھی، پڑھی اور اچھی لگی،تو آپ اپنے کلماتِ تحسین کمنٹ بکس میں لکھ سکتے ہیں، کچھ وضاحتیں مطلوب ہیں،تو وہ بھی طلب کر سکتے ہیں،جبکہ اگر اس کے کسی حصے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے،تو وہیں کمنٹ بکس میں آپ اپنے اعتراض کا بھی اظہار کر سکتے ہیں،کوئی روک بھی نہیں سکتا،خود لکھنے والا بھی نہیں

(۵)مطبوعہ ادب اور ڈیجیٹل ادب کے مابین ایک اور اہم فرق یہ بھی ہے کہ کتاب جب ایک بار چھپ گئی،تو دوبارہ اس میں حذف واضافہ یا ترمیم وتعدیل کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی، پروف ریڈنگ کے دوران اگر کوئی بڑی غلطی بھی رہ گئی،تو اس غلطی سمیت ہی اس کتاب کو عام کرنا ہوگا،اس کو دور کرنے کی عموماً کوئی شکل نہیں ہوتی،جتنی تصحیح یا ترمیم کرنی ہے،وہ آپ کتاب یا تخلیق کے چھپنے سے پہلے پہلے تک ہی کر سکتے ہیں،چھپ جانے کے بعد دوسرے ایڈیشن تک کسی ترمیم کی کوئی گنجایش نہیں۔اس کے برخلاف ڈیجیٹل ادب(تحریر،تخلیق،تصنیف)میں یہ گنجایش ہمہ دم موجود رہتی ہے، اگر آپ کو اپنی کسی تحریر میں کہیں کوئی جھول نظر آرہا ہے،تو آپ فوراً اسے دور کر سکتے ہیں، کچھ اضافہ کرنا ہے تو اس کی بھی سہولت موجود اور اگر کسی کوتاہی کو دور کرنا ہے،تو اس کا بھی امکان سو فیصد ہم دست۔

(۷)ڈیجیٹل ادب نے قاری اور تخلیق کار دونوں کو اِس معنی میں برابر کا درجہ دیا ہے کہ قاری براہِ راست اور بروقت کسی بھی تخلیق پر اپنے ردِعمل کا اظہار کر سکتا ہے،اسے کوئی روک نہیں سکتا،جبکہ اس کے برخلاف مطبوعہ کتاب پڑھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں؛ کیوں کہ کتابی ادب میں ساری اہمیت مصنف اور تخلیق کار کو دی جاتی ہے،تنقید کی اَساس بھی تصنیف یا صاحبِ تصنیف کے گرد ہی قائم ہوتی ہے،قاری کا

ذکر یا تو نہیں ہوتا ہے یا محض اضافی ذکر ہوتا ہے۔

(۷) ڈیجیٹل ادب میں مطبوعہ ادب کے بالمقابل ایک گونہ زیادہ آزادی و حرکیت پائی جاتی ہے؛ کیوں کہ بعض حالات میں کتاب یا مجلّات ورسائل کے بہت سے مواد کے سنسر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، جبکہ برقی ادب میں آپ اپنے تمام خیالات کو من وعن شائع کر سکتے ہیں۔

(۸) ڈیجیٹل کتابوں کو بسہولت جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں ،آپ کو کسی قسم کا بوجھ محسوس نہیں ہوگا، جبکہ مطبوعہ کتابوں کو ساتھ میں لیے لیے پھرنا بہت مشکل ہے۔انھی اسباب کی بنا پر آج مطبوعہ ادب کے قارئین روز بروز کم ہورہے ہیں، جبکہ ڈیجیٹل ادب کے قارئین میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، حتی کہ اب بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مطبوعہ ادب کا دور ختم ہوا چاہتا ہے اور آنے والے دس بیس سالوں میں ڈیجیٹل ادب کا ہی بول بالا ہوگا، بتدریج مطبوعہ کتابوں کا دور ختم ہوجائے گا اور ان کی جگہ ای بکس کا چلن عام ہوجائے گا۔

## ڈیجیٹل ادب کے مخالفین

جو لوگ ادب کے ڈیجیٹلائزیشن کے خلاف ہیں، ان کی دلیلیں بھی مضبوط، خاصی دلچسپ اور واقعات و حقائق سے ہم آہنگ ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈیجیٹل ادب پر جو معلومات پیش کی جاتی ہیں یا جو معلومات موجود ہیں ،وہ پوری اور مکمل نہیں ہیں ، یا تو وہاں ادھوری معلومات پیش کی جاتی ہیں یا وہ مخصوص قسم کی ہوتی ہیں، جو متعلقہ موضوع پر مکمل رہنمائی نہیں کرتیں، جبکہ دوسری طرف ابھی بھی ٹھوس، مکمل اور بھرپور معلومات کا زیادہ تر ذخیرہ مطبوعہ کتابوں کی شکل میں موجود ہے اور وہ ایسی معلومات ہیں، جو اب تک ڈیجیٹلائزڈ نہیں ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ابھی بھی قومی یا عالمی سطح پر ایک بہت بڑا علمی طبقہ جدید ٹکنالوجی سے اس حد تک نہیں جڑا ہے کہ وہ نوشت وخواند کے لیے اس پر انحصار کر سکے، پس ان سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے خواہی نخواہی مطبوعہ کتابوں کی قراءت لازمی ہے۔

(۲) جو ادب جدید ٹکنالوجی کی بدولت معرضِ وجود میں آرہا ہے، وہ اس حد تک محفوظ نہیں ہے، جتنا کہ مطبوعہ ادب محفوظ ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے؛ کیوں کہ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ دوسروں کی چیزیں پوری بے باکی کے ساتھ ہتھیا لیتے ہیں، مثلاً کسی نے فیس بک یا واٹس ایپ وغیرہ پر کوئی مضمون یا تحریر پوسٹ کی ، پھر کچھ ہی دیر بعد وہی پوسٹ کہیں اور، کسی اور شخص کے نام سے نظر آجاتی ہے، اتنا ہی نہیں ،اب تو مختلف بلاگنگ سائٹس پر پائی جانے والی بعض تحریروں کو کچھ لوگ روز نامہ

اخبارات میں بھی اپنے یا اپنے والد کے ناموں سے چھپوانے لگے ہیں، اس کی مثالیں آئے دن ہمیں دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ایک بار تو مجھے شدید حیرانی ہوئی؛ بلکہ سخت غصہ آیا، جب میں نے ادب وشعر سے مخصوص ایک واٹس ایپ گروپ پر معروف شاعر جون ایلیا کی ایک غزل ہندوستان کے سابق معروف صحافی عزیز برنی کے نام سے دیکھی، اتنا ہی نہیں، اب تو بہت سے جیالے اقبال و غالب کے کلام کو ہی غصب کرکے اپنے نام سے چپکا دیتے ہیں، یہ حرکتیں چھوٹے لوگ تو کرتے ہی ہیں، مگر میرے علم کے مطابق کئی ''بڑے'' قسم کے لوگ بھی اس چابک دستی کا مظاہرہ کرنے میں پیچھے نہیں ہیں؛ چنانچہ آج جہاں معروف دانش گاہوں میں پی ایچ ڈی تک کے مقالے کاپی پیسٹ کی مدد سے تحریر کیے جارہے اور تخلیق وتنقید کے نام پر تکرارِ حروف ونقوش کے نمونے پیش کیے جارہے ہیں، وہیں کئی بڑے اور نامور صحافی اپنی تہہ نگاری وحقائق نویسی کا چراغ مانگے کے اجالوں سے روشن کیے ہوئے ہیں، سال ڈیڑھ سال پہلے ہندوستان کے ایک مشہور اردو اخبار کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر پنامہ لیکس پر لکھتے ہوئے پڑوسی ملک کے کسی کالم نگار کی تفتیش و تحقیق پر ہاتھ صاف کرتے پائے گئے، جب پکڑ دھکڑ ہوئی، تو یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ابھی تو میں قسط وار لکھ رہا تھا، مضمون کے اخیر میں حوالہ دینے ہی والا تھا۔

الغرض اگر تحقیق کرنے لگ جایئے تو ایسی سیکڑوں مثالیں ملیں گی، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ برقی ادب وذرائعِ ابلاغ کی تیز رفتاری نے تحریروں کے حقوقِ اشاعت کو غیر محفوظ بنا دیا ہے۔

(۳) ایک اور بات یہ ہے کہ ڈیجیٹل ادب کے قارئین کا طبقہ ہر قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے، وہ لوگ بھی اسے پڑھتے ہیں، جو ذرا شعور اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں، جبکہ ایسے لوگ بھی ان تحریروں کو پڑھتے ہیں، جن کا علمی مبلغ بہت محدود ہوتا ہے؛ لیکن برقی دنیا، بطورِ خاص سوشل میڈیا کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں عام طور پر کوئی بھی شخص کسی بھی تحریر یا تخلیق پر اپنی رائے دینے سے نہیں چوکتا، پس اگر تخلیق کار ہر ایرے غیرے کی رائے پر توجہ دینے لگے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود تخلیق کار کا فنی، فکری وتخلیقی شعور ابھی ناپختہ ہے اور اس کے ذریعے سے جو تخلیق وجود میں آرہی ہے، وہ بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، اس کے برخلاف ورقی ادب یا مطبوعہ ادب کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں اولاً تو کسی کی کوئی تخلیق یا تحریر تبھی مطبوعہ شکل میں اشاعت پذیر ہوتی ہے، جب وہ اس لائق ہو، پھر ہر شخص اُسی موضوع کو پڑھنے کی زحمت کرے گا، جس سے اس کی وابستگی ہے یا جو موضوع اس کے دائرۂ فہم میں آتا ہے۔اس طرح کسی کتاب یا تخلیق پر اس کی رائے قابلِ قبول بھی ہوگی اور اس پر بحث کی بھی گنجایش ہوگی۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ ڈیجیٹل تخلیقات میں عموماً ٹیکنالوجی کے ماہرانہ استعمال اور چیزوں کو

پھیلانے پر زور دیا جاتا ہے،نفسِ مضمون کی ظاہری شکل وصورت پر بھی کچھ توجہ دی جاتی ہے؛لیکن اس کی معنویت اورانسانی شعورواحساس سے قریب کرنے یااس کی ترجمانی پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی، پس جوادب جدیدٹیکنالوجی کے ذریعےتخلیق ہورہاہے، وہ سپاٹ ہے،اس میں احساسات کی نرمی وگرمی کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔جبکہ اس کے برخلاف کاغذ پر لکھے جانے والے ادب میں تخلیق کارجتنا زورعبارتوں کو بنانے سنوارنے پر دیتا ہے،اتناہی زورتحریر کی معنویت اوراس کی مقصدیت کوثابت کرنے پر بھی دیتا ہے۔

(۵)مطبوعہ ادب قاری کومختلف موضوعات پرغوروفکرکرنے کا موقع دیتاہےاور کتاب بینی کی وجہ سے جسمانی عوارض کا بھی عموماً کوئی اندیشہ نہیں ہوتا،جبکہ ڈیجیٹل ادب کو پڑھتے ہوئے ایسامحسوس ہوتا ہے کہ بس نگاہ حروف ونقوش پر سے پھسلت جارہی ہے،قاری کو کچھ سوچنے اورغورکرنے کا موقع نہیں ہوتا،مزید یہ کہ اگرآپ ایک متعین وقت سے زیادہ کمپیوٹر یاموبائل سکرین پرنگاہیں گاڑے رہتے ہیں،تواس کے سخت نقصان دہ نتائج مرتب ہوسکتے ہیں،آنکھوں کی بینائی پرمنفی اثر پڑسکتا ہے۔

(٦)ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ڈیجیٹل ادب کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں ہے، بہت ممکن ہے کہ پانچ دس سال بعدآپ کی لکھی ہوئی چیزیں غائب ہوجائیں ، یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے،کئی لوگوں کی تخلیقات ضائع ہوچکی ہیں۔اس کے برخلاف جوچیزایک بارمطبوعہ شکل میں عام ہوگئی وہ محفوظ ہوجاتی ہے۔

## حقیقت کیا ہے؟

جوطبقہ الیکٹرانک ادب کی تایید کرتا ہے،وہ بھی عموماًانتہاپسندی کا مظاہرہ کرتا ہےاور جوطبقہ کتابی یا مطبوعہ ادب کا حامی ہے،اس میں بھی اعتدال پسندی کا فقدان ہے۔اصل حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک ادب اورمطبوعہ ادب ایک دوسرے کا حریف نہیں ؛ بلکہ ایک دوسرے کے لیے معاون اورانتشاروتوسیعِ ادب کے تسلسل کونئی منزلوں سے آشنا کروانے والا ہے،اس کو یوں سمجھنا آسان ہے کہ تعلیم وکتابت کا دورجب شروع ہوا،تب پتھروں اوردرخت کے پتوں پرلکھا جاتا تھا، پھر ہڈیوں ،کھالوں اورتختیوں پرلکھا جانے لگا، پھر ترقی ہوئی اورکاغذایجادہونے کے بعدافکاروتخلیقات کاغذات پرثبت کیے جانے لگے،اس کے بعداب یہ ترقیاتی رفتارمزیدآگے بڑھی،توکمپیوٹراوراس کے مشابہ نئی ٹیکنالوجی نے لے لی۔جس زمانے میں لوگ لکھنے کے لیے درخت کے پتے اورکھالیں استعمال کرتے تھے،اُس دور کے کسی انسان سے اگرکاغذ پر لکھنے پڑھنے کی بات کی جاتی،توکیاوہ مانتا؟یقیناًنہیں مانتا؛لیکن بہرحال بعد کےحقائق نےتویہ ثابت کیانا کہ لکھنے کا سفردرخت کے پتوں سے گزرکرکاغذات تک کی منزلیں طے کر چکا ہے اورجس طرح انسانی نسلیں بدلیں،اسی طرح اخذ واکتساب اورنوشت وخواند کے ذرائع بھی بدلتے رہے ہیں اور بدل رہے ہیں،اس

سلسلے میں معروف فرنچ اہلِ قلم فلپ بوٹز کا یہ قول لائقِ استناد ہے کہ ''یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ مطبوعہ تخلیقات اور الیکٹرانک (ڈیجیٹل) تخلیقات میں کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک استمرار ہے، جو ادب کو آہستہ آہستہ آگے کی طرف لے جا رہا ہے''۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی بھی نیا طرزِ اظہار یا طریقۂ تعبیر یکلخت عدم سے وجود میں نہیں آتا اور نہ اس کی اَساس پرانے اسلوب وطریقۂ تعبیر کو یکسر مسترد کرنے پر ہوتی ہے؛ بلکہ وہ پرانے اسلوب سے ہی نمو حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی چلتا رہتا ہے، بایں طور کہ پہلے کو دوسرے کا پس منظر کہا جائے اور دوسرے کو پہلے کی ترقی یافتہ صورت۔ آج جہاں نئی نسل کا ایک بڑا طبقہ الیکٹرانک کتابی دنیا سے وابستہ ہے، وہیں نئی اور پرانی نسل کا دوسرا اس سے زیادہ بڑا طبقہ کتابی اور مطبوعہ ادب سے وابستہ ہے، دوسرے یہ کہ فطری اور نفسیاتی طور پر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ چاہے کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل وغیرہ پر گھنٹوں وقت گزارتے ہوں؛ لیکن ان کے لیے الیکٹرانک کتابوں کا مطالعہ کرنا مشکل ہوتا ہے، وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر پاتے اور ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، پس کتابی ادب کے اختتام کا مفروضہ بس مفروضہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک اچھا خاصا طبقہ ان لوگوں کا ہے اور بتدریج تیار ہو رہا ہے ، جو الیکٹرانک ادب کو کمپیوٹر وغیرہ کی سکرین پر بھی بہ سہولت پڑھ سکتا ہے، پس دونوں قسم کے ادب کو ایک دوسرے کا رفیق سمجھنا چاہیے، نہ کہ فریق۔ نئی انفارمیشن ٹکنالوجی کی اختراع اور اس کے مختلف مظاہر کے سامنے آنے سے ادب کے قارئین کا دائرہ بڑھا بھی ہے؛ چنانچہ آج ہم فیس بک، واٹس ویپ وغیرہ پر ایسے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد پاتے ہیں، جو وہاں لکھ بھی رہے ہیں اور ایسے قارئین کا ایک حلقہ بھی بنا رہے ہیں، جو اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں سے اگر کہا جائے کہ مطبوعہ کتابیں پڑھو، تو وہ موجودہ دور کے عام مزاج کے زیرِ اثر اس سے معذوری ظاہر کرتے ہیں؛ لیکن وہ انہی کتابوں، تخلیقات، تجزیوں، تبصروں اور دیگر ادبی اصناف کو فیس بک یا واٹس ایپ وغیرہ کے ذریعے پڑھ رہے ہیں۔ جہاں تک سرقہ یا الیکٹرانک تخلیق کے غیر محفوظ ہونے کا مسئلہ ہے، تو اس سے علمی ومطالعاتی وسعت، بیداری ومستعدی اور جرأتِ اظہار کے ذریعے بخوبی نمٹا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کا بنیادی خاکہ مراکش کی مولیٰ اسماعیل یونیورسٹی میں تقابلی ادب کے پروفیسر اور نقاد محمد العنوز کے مقالہ ''**الأدب الورقي والأدب الرقمي: دراسة مقارنة**'' (ط: ماہنامہ الکلمۃ، جولائی 2016) سے مستفاد ہے۔

۞۞۞

## گوشۂ رشیدؒ

جامعہ کے روحِ رواں اور مستند عالم دین، ذہین وفطین، باوقار ومتین، حضرت مولانا عبدالرشید بستوی کی وفات پر ایک سال ایک لمحے کی طرح گذر گیا، وہ جامعہ کے صحن میں بادِ بہاری کا ایک خوشگوار جھونکا بن کر آئے اوراسی برق رفتاری کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہوئے فَإِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ۝ گذر گئے۔مولاناؒ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ جہت ہے، محدث عصر ماہ بماہ ''گوشۂ رشیدؒ'' کے عنوان کے تحت مولانا کے قدرداں، اہل علم، اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین ومتعلقین کے مولانا سے متعلق تأثرات ومضامین شائع کرے گا۔ان شاءاللہ

# مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ

## حیات وخدمات: ایک نظر میں

**ولادت:** ۲؍جنوری ۱۹۶۶ء موضع ''کمہریا''، ضلع بستی، یوپی

**تعلیم:** مدرسہ سراج العلوم، موضع کمہریا، اول تاچہارم عربی: مدرسہ انوارالاسلام، موضع مہوابسم اللہ خان، ضلع بلرام پور [سابق ضلع گونڈہ] یوپی۔پنجم وششم: جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مرادآباد۔ہفتم ودورۂ حدیث شریف: دارالعلوم دیوبند (۸۶-۱۹۸۵ء) تکمیل ادب: دارالعلوم دیوبند (۸۷-۱۹۸۶ء)

**تدریس:** دارالعلوم اسلامیہ، شہر بستی، یوپی۔مدرسہ قاسم العلوم، قصبہ چند گڑھ، ضلع کولہاپور، مہاراشٹر۔ جامعۃ القرآن الکریم، موضع جھنڈا پور، ضلع بجنور، یوپی۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم وقف دیوبند، جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند (تاحیات)

**غیر تدریسی خدمات:** بحیثیت مترجم ومؤلف: دارالمؤلفین، دیوبند اور مرکز المعارف، آسام برانچ دیوبند [مریم اجمل فاؤنڈیشن، دیوبند] میں خدمات انجام دیں۔

**تصنیفات و تالیفات:** ۱-عورت اسلام کے سائے میں ۲-مذہبی رواداری ۳-در حدیث دیگراں، سیرت نبوی ۴-علامہ انور شاہ کشمیری اپنی ہشت پہلو شخصیت کے آئینہ میں ۵-محاورات وامثال عربی سے اردو ۶-محاورات و امثال اردو سے عربی ۷-مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق ۸-خیر المجالس، مجلسی علمی جواہر پارے، حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ۔[تمام مطبوعہ] ۹-انسانی حقوق کا اسلامی وعالمی منشور، تقابلی مطالعہ [غیر مطبوعہ]

**اردو سے عربی ترجمہ:** ۱-حیات شیخ الہند، از: حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں دیوبندیؒ۔ ۲-خاتم النبیین (فارسی) از: حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ۔ ۳-نقشِ حیات (جلد دوم)

از: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ ۴-العقل والنقل، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ ۵-الاسلام، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ ۶-اسلام میں مرتد کی سزا، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ ۷-انسان اور انسانیت، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ ۸-رمضان کے روزے، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ ۹-قربانی کا فلسفہ، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ ۱۰-ڈاڑھی اور انبیاء کی سنت، از: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ ۱۱-نوادرات امام کشمیریؒ، از: حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ۔

**عربی سے اردو ترجمہ:** ۱-رجال السند والہند، از: حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ۔ ۲-ہدایۃ المرشدین، از: حضرت علامہ علی محفوظ مصریؒ۔ ۳-**من أدب الإسلام**، از: حضرت علامہ عبدالفتاح ابوغدہ شامیؒ۔ ۴-**العقد الثمین فی معالم دار الرسول الأمین**، از: شیخ محمد امین غالی شنقیطی۔ ۵-کتاب الفتن، از: حضرت علامہ نعیم بن حماد مروزیؒ۔ ۶-یتیمۃ البیان، از: حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ۔ ۷-**فقہ أھل العراق و حدیثھم**، از: حضرت علامہ زاہد کوثری مصریؒ۔ ۸-إلی علماء نجد، از: شیخ ہاشم رفاعی، کویت۔ ۹-دیوان الامام الشافعی، جمع وترتیب: حضرت مولانا عبداللہ کاپودری۔ ۱۰-أولیات عمر الفاروقؓ، حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ۔ ۱۱-موقف ابن تیمیۃ من التصوف والصوفیۃ، از: شیخ دکتور محمد بن احمد بنانی۔ ۱۲-من معین الشمائل (نصف کتاب)۔ ۱۳-**فرقان القرآن بین صفات الخالق و صفات الأکوان**، از: شیخ علامہ قضاعی مصری شافعیؒ۔

**تحقیق و تعلیق:** ۱-اشاعتِ اسلام، از: حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ۔ ۲-آئینۂ حقیقت نما، از: حضرت مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادیؒ۔ ۳-تقریر دل پذیر، از: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ ۴-حجۃ الاسلام، از: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ ۵-تذکرۃ النعمان، اردو ترجمہ، از: حضرت مولانا عبداللہ بستوی مہاجر مدنیؒ۔

**عہدے و مناصب:** ۱-نگراں شعبۂ تالیف وترجمہ عربی واردو، مریم اجمل فاؤنڈیشن، دیوبند [برانچ مرکز المعارف، آسام] ۲-ریسرچ اسکالر شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند۔ ۳-صدر مدرس و شیخ الحدیث [ثانی] جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند ۴-چیف ایڈیٹر ماہ نامہ ''راہِ مصطفیٰ'' ہندی، جودھپور، راجستھان۔ ۵-مرکزی جنرل سکریٹری، تنظیم علماء ہند۔ ۶-نائب صدر آل انڈیا اردو مجلس، بمبئی۔ ۷-رکن مجلس ادارت ماہ نامہ ''محدث عصر'' جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند۔ ۸-سرپرست مدرسہ نعمانیہ، کمل پور، سورجاپور کنکی، ضلع دیناج پور، بنگال۔

**وفات:** ۲۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء بروز جمعرات **تدفین:** مزارِ انوری، نزد عیدگاہ دیوبند۔

# حضرت الاستاذ: حیات اور کارنامے

مفتی وصی احمد قاسمی بستوی
صدر المدرسین واستاذ حدیث وفقہ جامعہ ہذا

استاذ گرامی مولانا عبدالرشید صاحب بستوی صدر المدرسین جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند ۲؍جنوری ۱۹۶۶ءکو موضع ''کمہریا''، ضلع بستی یوپی میں پیدا ہوئے، نام عالم ربانی فقیہ النفس محدث دوراں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے نام پر رکھا گیا، اس کی وجہ حضرت گنگوہی کے تئیں وہ عقیدت تھی، جو مولانا کے والد ماجد حاجی گل محمد صاحب مدظلہ کے دل میں پیدا ہوگئی تھی، جو ان دنوں دہلی میں ایک گنگوہی تاجر کے مینیجر کی حیثیت سے کام کررہے تھے، اور وہ حضرت گنگوہی کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتا تھا، یہ نام بعد میں مدرسوں میں پہنچ کر عبدالرشید ہوگیا۔

آپ نے مکتبی تعلیم گاؤں کے مدرسہ سراج العلوم میں حاصل کی، عربی فارسی کے لئے علاقے کے اس وقت کے نیک نام ادارے مدرسہ عربیہ انوارالاسلام مہوا بسم اللہ خاں ضلع بلرام پور میں داخلہ لیا، اور عربی چہارم تک کسب فیض کرتے رہے، وہاں کے دو اساتذہ کا بطور خاص ذکر کرتے رہتے تھے، ایک مولانا حفظ الرحمن صاحب معروفی اور دوسرے مولانا افضال الحق جوہر صاحب اعظمی، اول الذکر کا تذکرہ زیادہ اہتمام سے کرتے تھے، عربی پنجم وششم کی تعلیم آپ نے مرادآباد کے نامور ادارے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں حاصل کی، وہاں کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد اسعد صاحب دیوریاوی کا کثرت سے ذکر خیر فرماتے تھے، عربی ہفتم اور دورہ حدیث شریف کے لئے آپ نے ام المدارس مرکز رشد وہدایت دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور امتیازی نمبرات سے ۱۹۸۶ء میں فراغت حاصل کی اور وہیں سے عربی زبان وادب کی تکمیل بھی فرمائی، یہاں کے اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ، بحر العلوم حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی مدظلہ اور شیخ الادب حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ ایڈیٹر

الداعی عربی سے بطور خاص متاثر تھے۔

فراغت کے بعد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ کی ایماء پر شہر بستی کے مردم خیز ادارے دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں تدریس کے شعبے سے منسلک ہوگئے، مولانا کی وہاں تشریف آوری عربی زبان وادب کے حوالے سے ادارے میں ایک انقلاب کی نوید تھی، مولانا نے زبان کے حوالے سے وہاں جومحنت کی اوراس کے جوخوش گوار اور دیر پا نتائج برآمد ہوئے، آج بھی وہاں کے ذمہ داران گرامی قدر اس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔لیکن وہاں کا عرصۂ تدریس بہت مختصر رہا، ان کے رفیق درس مولانا عبدالقدوس صاحب نیرانوی حال استاذ دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ نے انہیں جامعۃ القرآن الکریم جھنڈا پور ضلع بجنور کھینچ لیا، اس وقت وہاں تعلیمی ماحول اچھا تھا اور غیر مقلدیت کے اثرات بھی نمایاں نہیں تھے، اس لئے وہاں جانے میں انہوں نے کوئی حرج محسوس نہیں کیا،لیکن جلد ہی انھیں لگا کہ یہاں ماحول مساعد نہیں ہے،غیرت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، استاذ گرامی حضرت کیرانوی کی اجازت سے اسے بھی چھوڑ دیا اور مرکز المعارف ہوجائی آسام برانچ دیوبند کے شعبۂ تالیف وترجمہ سے وابستہ ہوگئے، یہاں بھی آپ نے پوری مستعدی وسرگرمی کا مظاہرہ کیا،مختلف کتابوں کے ترجمے کئے اور دیگر اہل قلم سے بھی کرائے، ہرسال تحریری مسابقے کا بھی معمول تھا جس میں دیوبند کے کسی بھی ادارے کا طالب علم حصہ لے سکتا تھا، شرکاء کو نقد اور کتب کی شکل میں بہت معقول انعام دیا جاتا تھا۔

مرکز المعارف میں کام کرتے ہوئے احاطۂ دارالعلوم میں آپ کی صلاحیتوں کا چرچا ہو چکا تھا، چنانچہ ۱۴۲۱ھ میں جب دارالعلوم کو ایک عربی مدرس کی ضرورت ہوئی تو بلا مقابلہ آپ کو منتخب کرلیا گیا، دارالعلوم کی چار سالہ مدت خدمت آپ کی تدریسی زندگی کا دورِ شباب ہے،عربی زبان وادب مولانا کا خاص میدان تھا، اس لئے تکمیل عربی ادب کے دو بنیادی اسباق اسالیب الانشاء اور آزاد تمرین آپ سے متعلق کیے گئے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے ان دونوں گھنٹوں کا حق ادا کردیا،طلبہ بلا تکلف عربی بولنے اور لکھنے لگے، اوران کو اس میں لطف آنے لگا،لیکن شاید مولانا کو نظر لگ گئی، ایک قضیے کی وجہ سے آپ دارالعلوم سے سبک دوش کردیے گئے۔

سبک دوشی کے بعد کا مرحلہ آپ کے لئے سخت جانکاہ تھا،طبیعت بالکل بجھ گئی تھی،کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے، مظاہر علوم سہارن پور، ریاض العلوم گورینی جون پور اور اشاعت العلوم اکل کوا سے پیش کش ہونے کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے، اسی دوران انہیں کے ہم وطن ایک کرم فرما جو دیوبند میں ایک نیک نام ادارے کے مہتمم ہیں اور اس وقت بانی جامعہ امام انور فخر المحدثین حضرت مولانا محمد انظر شاہ

کشمیری نور اللہ مرقدہ کی مجلس کے حاضر باش تھے، انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے مولانا کا تذکرہ کیا اوران کی علمی لیاقتوں کا بھی، حضرت شاہ صاحب کی طلب پر انہوں نے مولانا کی ایڈٹ کردہ ایک کتاب ''آئینۂ حقیقت نما'' بھی دکھائی، کتاب دیکھ کر حضرت شاہ صاحب فرمایا!'' بھائی یہ تو کوئی کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، انہیں ضرور بلاؤ''اس طرح آپ اس وقت کے نوخیز اوراب شہرت یافتہ ادارے جامعہ امام انور شاہ دیوبند سے وابستہ ہوگئے۔

جامعہ سے وابستگی میری معلومات میں ایک عارضی وابستگی تھی، لیکن حضرت شاہ صاحب کی پرکشش شخصیت نے اسے دائمی بنادیا، یہاں آنے کے بعد آپ کی پژمردہ طبیعت پھر تروتازہ ہوگئی، خوابیدہ صلاحیتوں مچلنے لگیں، ادارے میں غالباً حفظ تا عربی دوم کی تعلیم تھی، جو آپ کے آتے ہی عربی چہارم تک کردی گئی، حضرت شاہ صاحب نے آپ کی لیاقت اور دل چسپی دیکھتے ہوئے تعلیم وتربیت کے جملہ امور آپ کے سپرد کردیے، اوراس ختیار کے ساتھ کہ جب کوئی ان کے پاس سفارش کے لئے آتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ بھائی میں نے مدرسہ مولوی رشید کے حوالے کردیا ہے، انہیں سے بات کرو، مولانا نے بھی اس اعتماد کا حق ادا کیا، معیار تعلیم وتربیت کو بلند تر بنانے کے لئے سخت اصول بنائے اوران کی مکمل پاس داری کی، اوراس سلسلے میں اپنوں اورغیروں کی کوئی رعایت نہیں کی، اس کے نتیجے میں ان کے کچھ اپنے متعلقین سے بھی تعلقات متاثر ہوئے، خود احقر سے جامعہ میں تقرر کے وقت فرمایا کہ کبھی مجھ سے کوئی سفارش مت کرنا، ان چیزوں کا اثر یہ ہوا کہ ادارے نے بڑی برق رفتاری سے نیک نامی حاصل کی، اورشہرت کے بام عروج پر پہنچ گیا، اوراب درجۂ ناظرہ تا تکمیل افتاء تعلیم کا ایک مرکز بن چکا ہے، ان سب امور میں جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب مسعودی مدظلہ نے، جن کو ہم لوگ ''بھائی احمد'' کہتے ہیں، واقعی مولانا کے بڑے بھائی کا کردار ادا کیا، ان کے تعاون ونگرانی کے بغیر ان میں سے کچھ بھی ممکن نہیں تھا جو ہوا، حفظہ اللہ ورعاہ۔

جامعہ میں رہتے ہوئے مولانا نے اپنے کو صرف تدریس تک محدود نہیں رکھا، بلکہ تالیف وترجمہ وکالم نگاری کا سلسلہ بھی رکھا، آپ کی آمد سے ''مجمع الانور للتالیف والترجمہ'' کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، فخر المحدثین حضرت شاہ صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب ''نوادرات امام کشمیری'' کی آپ نے تعریب کی، امام العصر حضرت علامہ کشمیری کی انتہائی تحقیقی کتاب ''خاتم النبیین'' کی بھی تعریب کی، انوار الباری شرح بخاری کے تکملے کا آغاز کیا، حضرت علامہ کی مشہور کتاب ''مشکلات القرآن'' کے مقدمے کا ترجمہ کیا، ''حضرت علامہ کشمیری ایک ہشت پہلو شخصیت'' کے نام سے ایک مستقل تصنیف فرمائی، جو میرے

نزدیک حضرت علامہ کی سوانحات میں ''نقش دوام'' کے بعد سب سے وقیع کتاب ہے۔

فخر المحدثین حضرت شاہ صاحب آپ کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے بڑے قدردان تھے، اور خود آپ کو حضرت شاہ صاحب سے عشق تھا، کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں، اتنے کمالات کسی عالم میں بہت کم پائے جاتے ہیں، یہ شدید تاثر ہی تھا کہ آپ نے بغیر کسی تشکیل کے حضرت شاہ صاحب کے مجلس افادات مرتب کرنا شروع کر دیے اور یہ سلسلہ جب تک صحت رہی جاری رہا، مختلف النوع معلومات کا یہ ذخیرہ خیر المجالس کے نام سے چھپ چکا ہے، شاہ صاحب کی مادی ومعنوی نوازشات کا ذکر بھی کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ وہ ایک بے نظیر عالم ہی نہیں بہترین انسان بھی ہیں نور اللہ مرقدہ۔

آپ ایک پختہ کار مدرس تھے، درس جامع اور خود اعتمادی سے لبریز ہوا کرتا تھا، عربی زبان کی تدریس میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، بہت کم وقت میں طلبہ میں زبان وادب کا ذوق پیدا کر دیتے تھے، حدیث اور عربی ادب سے خاص دلچسپی تھی، وفات سے ایک دن قبل تک بخاری شریف جلد ثانی کا درس انتہائی آن بان سے دیا۔

خطابت کا انداز نہ واعظانہ تھا اور نہ خطیبانہ، بلکہ دونوں کے درمیان تھا، ہر موضوع پر بولتے تھے اور بلا تکلف بولتے تھے، اور اس حوالے سے اطراف اور دور دراز مدعو بھی کیے جاتے تھے، جامعہ کا کوئی پروگرام ان کے خطابت کے بغیر ادھورا خیال کیا جاتا تھا۔

اردو اور عربی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے، اور بہت رواں، تحریر میں بھرتی کے الفاظ نہیں ہوتے تھے، مغز ہی مغز ہوتا تھا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جامعہ میں تشریف آوری سے قبل اردو ادیب کی حیثیت سے آپ کو کوئی نہیں جانتا تھا، لیکن فخر المحدثین حضرت شاہ صاحب کی دور رس نگاہوں نے تاڑ لیا کہ اس عربی ادیب کے اندر ایک اردو ادیب بھی بیٹھا ہوا ہے، حکم ہوا کہ مولوی رشید صاحب محدث عصر کے نام سے جامعہ کا ایک ماہانہ ترجمان نکلنا ہے، مولانا تیار ہو گئے اور پھر اتنا لکھا اور اتنا اچھا لکھا کہ حضرت شاہ صاحب کے رنگ میں آ گئے، اس لئے احقر راقم الحروف آپ کی اردو نگاری کو نفحۂ شاہی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

تالیف وترجمہ آپ کا مستقل مشغلہ تھا، جو زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا، میری دانست میں آپ کی تصنیفات تراجم اور ایڈٹ کردہ کتابوں کی تعداد کم از کم ۳۵ ؍ رہے، جامعہ میں تالیف وترجمہ کردہ کتب کے علاوہ آپ کی تصنیفات میں ''عورت اسلام کے سائے میں''، ''مذہبی رواداری''، ''درحدیث دیگراں''، ''مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق''، ''انسانی حقوق کا اسلامی منشور''، اور ''محاورات وامثال'' شامل ہیں، تعریبات میں حیات شیخ الہند از حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، انسان اور

انسانیت از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، ڈاڑھی اور انبیاء کی سنت از شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، العقل والنقل از حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اہم ہیں، تراجم میں ہدایۃ المرشدین از علامہ علی محفوظ مصری، کتاب الفتن از علامہ نعیم ابن حماد مروزی، فقہ اہل العراق وحدیثہم از علامہ زاہد الکوثری مصری، الی علماء نجد از شیخ ہاشم رفاعی کویت، العقد الثمین فی معالم دارالرسول الامین از شیخ محمد امین شنقیطی، موقف ابن تیمیۃ من التصوف از شیخ محمد ابن احمد بنانی، اور رجال السند والہند از مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری انتہائی وقیع ہیں، موخر الذکر دونوں کتابوں کے ترجمے میں احقر کو بھی تعاون کی سعادت حاصل رہی ہے۔ ایڈٹ کردہ کتب میں تقریر دل پذیر از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، اشاعت اسلام از حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی اور آئینہ حق نما از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ کے تلامذہ کی فہرست بھی کافی طویل ہے، ممتاز تلامذہ میں مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی نائب مہتمم واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند، مولانا محمد اسجد قاسمی بستوی، شیخ الحدیث مدرسہ امدادیہ مرادآباد مولانا محمد مزمل صاحب بدایونی، مولانا مصلح الدین سدھارتھ نگری، مولانا اشرف عباس قاسمی، مولانا افضل حسین بستوی مولانا محمد ارشد معروفی، مولانا فہیم الدین بجنوری، مولانا جرار احمد سہارن پوری اساتذہ دارالعلوم دیوبند۔ مولانا محمد اللہ خلیلی فیض آبادی شعبۂ انٹرنیٹ دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد اسعد گورکھ پوری استاذ دارالعلوم وقف دیوبند، مولانا محمد خالد سعید مبارک پوری استاذ مظاہر علوم سہارن پور، مولانا ظہیر الہدیٰ قاسمی ایڈیٹر ماہنامہ ''المظاہر'' عربی واستاذ مظاہر علوم سہارن پور، مولانا مفتی عفان صاحب منصور پوری ناظم تعلیمات مدرسہ اسلامیہ امروہہ، مولانا افتخار احمد خلیل آبادی، مولانا سلیمان اختر فاروقی اساتذہ اشاعت العلوم اکل کوا مہاراشٹر، مولانا محمد ابراہیم قاسمی ایڈیٹر ماہنامہ مولانا محمد سلمان بستوی استاذ حدیث مدرسہ خادم العلوم باغوں والی مظفر نگر اور مولانا محمد ابراہیم قاسمی ایڈیٹر ماہنامہ ''نقش راہ'' واستاذ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ شامل ہیں۔

علمی کمالات کے ساتھ اخلاقی خوبیاں بھی بے پناہ تھیں، خود سازی کے بجائے افراد سازی پر توجہ دیتے تھے، جس طالب علم کو ہونہار دیکھتے، اس پر خصوصی توجہ دیتے، حوصلہ افزائی کرتے اور کچھ کر گزرنے کی ترغیب دیتے، کئی فضلاء کی گہری وابستگی کا سبب آپ کا یہی طرز عمل تھا، خیر خواہی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کا کہنا ہے کہ مولانا نے اپنے دور نظامت تعلیمات میں کبھی مجھ سے اسٹاف کی شکایت نہیں کی، ہمیشہ ان کا دفاع ہی کرتے، تواضع وفروتنی آپ کا مخصوص وصف تھا، پچاسوں کتابوں کے مولف ومترجم ہونے کے باوجود کبھی اپنی زبان سے ان کا تذکرہ

نہیں کرتے تھے، معروف پیر طریقت حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کے مجاز بیعت تھے، لیکن آپ کے متواضعانہ مزاج کی وجہ سے شاید لوگوں کو اس کا علم بھی نہیں ہے، چھوٹوں کا نام بھی احترام سے لیتے تھے، طلبہ کو بالعموم مولوی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، اپنے اساتذہ کی تعظیم وتوقیر کا بڑا خیال تھا، کوئی کم زور جملہ ان کے تئیں نہ کہتے تھے اور نہ سننا پسند کرتے تھے، اوراد ووظائف کے شدت سے پابند تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں ظرافت بھی تھی، مگر وقار کے ساتھ اور دوسروں کی عزت نفس کا لحاظ رکھتے ہوئے، الغرض خوبیوں کا ایک پیکر تھا، جو ۲۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء شب جمعہ کو بہت جلد ہم سے رخصت ہوگیا۔

پسماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ تین بچے اور تین بچیاں ہیں، بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ سلمہ ایک ہونہار اور مستعد نوجوان ہیں، جامعہ میں عربی کے استاذ ہیں، امید ہی نہیں یقین ہے کہ وہ اپنے والد گرامی کی جانشینی کا حق ادا کریں گے، دوسرے فرزند عزیزم عبدالسلام ہیں، جو پونے میں ایک ادارے میں زیر تعلیم ہیں، تیسرے فرزند عزیزم عبدالصمد ہیں جو دیوبند کے ایک کالج میں بارہویں کلاس میں ہیں، تین بچیوں میں بڑی صاحبزادی شادی شدہ ہیں اور دو ابھی کم سن ہیں۔

اخیر میں بارگاہِ ستار وغفار میں دعا ہے کہ وہ آپ کو کروٹ کروٹ راحت نصیب کرے اور آخرت کی جملہ آسائشیں مہیا فرمائے۔ آمین

۞۞۞

مولانا عبدالرشید بستویؒ

# نام زندہ رہے گا

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

کیوں نہ ہوں صحبتِ احباب کی مجلسیں ویراں
شمعِ محفل نہ رہی، لطفِ شبستاں نہ رہا

میں اپنے احباب سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہم لوگ عجیب قسمت لے کر آئے ہیں ہمارے پاس اپنوں کو رونے کے لیے بھی وقت نہیں ہے، ایک دوست درمیان سے اٹھا، دوسرے نے آنکھیں بند کیں، تیسرے نے عدم کی راہ اختیار کی، چوتھے نے ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ کچھ دن تذکرہ، کچھ گھنٹے مرحوم کی باتیں اور پھر کبھی کبھی جانے والے کے اوصاف اور خوبیوں پر گفتگو، اتنا ہی غم، اتنا ہی ماتم اور اتنا ہی تعلق۔ اس کے بعد وہی زندگی، وہی مصروفیات، وہی بھاگ دوڑ، وہی مجلسیں، وہی قہقہے، مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ آناً فاناً بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوگئے، دور دور بھی ایسا گمان نہیں، گوشۂ ذہن میں ادنیٰ سا بھی خیال نہیں اور نہ قلب کی کوئی ایسی قریبی کیفیت، معمول کے مطابق دن گذر رہے تھے اچانک ۲۵ / اکتوبر ۲۰۱۸ء بروز جمعرات مغرب کے بعد برادرِ مکرم مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب مسعودی نے اس حادثۂ فاجعہ سے مطلع کیا، اتفاق یہ ہے کہ جس وقت فون آیا میں مولانا مرحوم کے مکان کے قریب ہی تھا اس خبر کے سچ ہونے میں کوئی تامل نہیں تھا مگر دل کو سمجھانے اور یقین کرنے میں وقت لگا۔

مولانا عبدالرشید بستوی سے تعلق کا زمانہ اتنا ہی ہے جتنا زمانہ جامعہ امام محمد انور شاہ میں ان کی ملازمت کا ہے، میرے یہاں ان کی آمد و رفت شروع ہوئی میں بھی ان کے پاس چلا جاتا اس طرح جلد ہی ان سے ایک حد تک بے تکلف ہوگیا اس بے تکلفی میں کہیں نہ کہیں ادب کا پہلو رہتا تھا، مولانا اتنے سنجیدہ، متین اور خاموش طبع تھے کہ آسانی کے ساتھ بے تکلفی کی منزلیں طے نہیں ہوسکتی تھیں، وقت گزرتا رہا بے شمار مجلسیں، نشست و برخاست ایسے کتنے مواقع آئے بتانا مشکل ہے، ہر مجلس اور ہر جگہ پر مولانا باوقار انداز میں

شریک ہوتے مختصر یا طویل ملاقاتوں میں ان کا یہی رنگ تھا، کم گوئی تو تھی مگر گفتگو ضرور کرتے، ایسا نہیں کہ بے زار بیٹھے ہیں چہرے پر الجھن کے آثار ہیں، صلاحیت قابلِ ذکر تھی اور معاصرین میں ان کی عبقریت قائم تھی۔

مولانا پر علم اور شرافت کا غلبہ تھا ایک عالم کی زندگی ظاہر میں بھی تھی باطن میں بھی، انہوں نے تحصیلِ علم میں بڑی محنت کی تھی زمانۂ طالب علمی میں ان کی پوری توجہ درس میں حاضری اور کتابوں پر مرکوز رہی، مطالعہ کا شوق تھا اس لیے پڑھنے میں لگے رہتے، کچھ بننے کا جنون تھا ادھر اُدھر کی مصروفیت کوئی نہ تھی وقت کے بہترین استعمال کا سلیقہ اور جذبہ تھا ان کی ترقی، کامیابی، نیک نامی، ناموری، مقبولیت میں جہاں ان کی دیگر فطری خوبیوں اور خصوصیتوں کا ہاتھ رہا وہیں وقت کی پابندی اور وقت پر کام انجام دینے کی فکر نے ان کو تقویت پہنچائی اور ان کا تفوق قائم ہوا۔ میں نے ان کا درس تو نہیں سنا معاصرین ان کے کامیاب تجربہ کار اور باکمال مدرس ہونے کی شہادت دیتے ہیں اور سبھی ان کے منفرد اور اچھوتے طریقۂ درس کے قائل ہیں۔

ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق بہت بار ہوا، بہت اچھا لکھتے تھے، علمی انداز بھی تھا، تحقیقی رنگ بھی، ادبی گلکاریاں بھی تھیں، زبان و بیان کی جلوہ آرائیاں بھی، اسلوب و ادا کی رعنائیاں بھی، سلاست اور روانی کی خوشنمائیاں بھی، کم لوگ اتنا اچھا لکھتے ہیں، کم ہیں جن کو اعتبار اور پسندیدگی کی سند حاصل ہے، مولانا مرحوم ان قلم کاروں میں تھے جن کی تحریروں پر اعتماد کیا جاتا، اردو کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بولنا اور لکھنا دونوں ہی ان کے لیے آسان تھا، ترجمہ کی صلاحیت اس کے سوا تھی۔ غرض عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کامل تھے، ہزاروں مقالات و مضامین کے خالق تھے، ساتھ ہی بہت سی کتابوں کے بلند فکر مصنف بھی۔

تقریر جچی تلی تھی جوش اور ولولہ سے کوئی علاقہ نہ تھا، سہل انداز اور خطیبانہ تیور، سبک اور رواں اندازِ تقریر، موضوع کی حدود اور دائروں سے باہر قدم نہ نکالتے، مطالعہ کی جھلکیاں تقریر میں بھی باقی رہتیں، موضوع کو سمیٹ لینے اور حق ادا کرنے کے رموز سے واقف تھے، ان کی تقریریں سنیں کئی، مواقع پر اسٹیج پر ان کے ساتھ رہا، اخلاصِ نیت ایک ایسا جوہر اور نعمتِ خداوندی ہے کہ جن قلوب میں یہ جگہ بنالے اور جن لوگوں کو یہ میسر ہو ان کے کاموں میں اور قبولیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، مولانا مرحوم اس جوہر سے مالا مال تھے اس لیے ان کی تقریریں سامعین پر گہرا تاثر قائم کرتی تھیں۔

مولانا مرحوم کو سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی گو عملی نہ تھی، ملکی اور بین الاقوامی منظرنامے پر گہری نظر رکھتے تھے اخبار کا مطالعہ معمول کا حصہ تھا کسی واقعہ اور خبر سے نتائج اخذ کر لینے اور منظر و پس منظر کے درمیان تعلق

قائم کرنے کی صلاحیت فطری تھی۔ مقامی حالات سے بھی بے خبر نہیں رہتے تھے، تنقید کا مزاج نہیں تھا متوازن رائے رکھتے تھے، حالاتِ حاضرہ پر لب کشائی کرتے تو کوئی نکتہ ضرور پیدا کرتے، بے وزن بات کرنے کی عادت نہ تھی، جب بولتے حاضرین ان کی بات غور اور توجہ سے سنتے۔

مجھے ان کے ساتھ سفر کا بھی اتفاق ہوا، ایک بار آسام کا ہفتہ عشرہ کا سفر تھا جس میں مولانا مفتی محمد وصی صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب، مولانا سکندر صاحب بھی شریک تھے، مولانا بہترین رفیقِ سفر تھے، سفر میں ان کی نکھری شخصیت کی پرتیں کھلیں، دوسرا قابل ذکر سفر گجرات کا رہا، یہ سفر بھی دس روز سے کم کا نہیں تھا، میں اور مولانا مرحوم اس سفر کے ساتھی تھے یہ وہ وقت تھا جب مولانا عبدالرشید صاحب شوگر کے مرض میں گھر چکے تھے، شوگر کی بیماری جب سے لپٹی تھی کھانے پینے میں محتاط ہو گئے تھے مگر کبھی بد پرہیزی بھی کر جاتے، رمضان ۱۴۳۹ھ کے بعد سفر سے واپس آئے تو کمزور دکھائی دیئے ان کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے اور دھیمی گفتگو سے اس کا اندازہ ہوتا تھا، ان سب چیزوں کے باوجود اس کا تصور نہیں تھا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ زندگی کو خیر باد کہہ کر موت کی وادی میں قدم رکھ دیں گے، حکم رب جب بھی آئے اور جس کے لیے بھی آئے وہ رخصت ہو جائے گا اس قانونِ الٰہی کے تحت مولانا عبدالرشید صاحب نے الوداع کہا، ہر بار کی طرح مولانا مرحوم کی وفات نے بھی اس سچائی کو زندہ کیا۔

دنیائے بے ثبات میں ہر شئے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے ہر صبح کی ہے شام

اب ایصالِ ثواب کے ساتھ ساتھ مولانا کی مغفرت، بلندیٔ درجات اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعائیں ہماری معمول کی دعاؤں کا حصہ ہیں۔

۞۞۞

مولانا عبدالرشید بستویؒ

# علم وعمل کی ایک تابندہ تصویر

مولانا شفیق احمد صاحب بستوی، کراچی

ہماری زندگی میں کچھ ایسی شخصیات نمایاں ہوتی ہیں جو اپنی گوناگوں خوبیوں اور ہمہ جہت کمالات کے سبب ہمارے ذہن وضمیر میں اپنا انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں، پھر وہ زمان ومکان کے فاصلاتی بُعد کے باوجود ہمہ وقت ہمارے ذہن وضمیر کی دنیا میں ایسی رچی بسی رہتی ہیں کہ ان کو بھلایا نہیں جاسکتا اور بالخصوص جب کہ ان سے ذاتی نوعیت کی وابستگی اور تعلق داری قائم ہو، ایسی شخصیات کی جدائی اور ابدی مفارقت بلاشبہ سوہانِ روح بن جاتی ہے اور دل ودماغ ایک ناقابل بیان صدمہ ورنج کی کیفیت سے دوچار ہوجاتے ہیں، بعدازاں جب جب وہ یاد آئیں تو بس زیر لب دعائیں اور سرد آہیں فقط، قلب وروح کا ساتھ نبھاتی ہیں۔ کچھ اسی طرح کی شخصیت احقر کی زندگی میں حضرت مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ کی تھی جو تقریباً احقر کے ہم عمر اور ہم وطن وہم زمانہ ہی صرف نہ تھے بلکہ بہت سے اساتذۂ کرام سے استفادہ میں بھی شریک تھے، خصوصاً وحیدالعصر وشیخ الادب دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں ہم دونوں ہی سابق ولاحق کے طور پر شریک رہے۔ یاد آتا ہے کہ غالباً ۱۹۸۴ء میں انجمن تہذیب الکلام طلبہ ضلع بستی کے قلمی وعلمی ترجمان ماہنامہ ''عقاب'' کی ادارت مولانا عبدالرشید صاحب مرحوم کے پاس تھی اور انجمن کی نظامت احقر کے پاس تھی، اس دور سے ہی مولانا مرحوم ادبی ذوق کا بہترین مظاہرہ فرمارہے تھے اور اچھوتے مضامین سپرد قرطاس وقلم فرمارہے تھے، زمانۂ طالب علمی کا اختتام ہوا تو احقر وطن سے دور افتادگی کا ہدف ٹھہرا اور مولانا مرحوم تدریسی خدمات کی انجام دہی کے لئے دارالعلوم اسلامیہ بستی اور دارالعلوم ہوجائی آسام تشریف لے گئے جہاں انہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک بیش قیمت اور طویل حصہ گذار کر بے شمار تشنگان علم دین کو اپنے علم وفن سے سیراب کیا۔ بعدازاں مادر علمی ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات کے لئے تشریف لائے اور ایک زمانہ بھرپور جہد مسلسل

کے ساتھ گذارا، جہاں اپنے کئی اساتذۂ کرام کی معیت وشفقت سے بہرہ ور ہوئے اور پھر دیوبند ہی کے ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ قدرتی اسباب کے تحت مولانا مرحوم حضرت العلامہ مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے نوتاسیس شدہ ادارہ جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند میں اپنی خدمات کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے تشریف لے آئے اور پھر تاحیات اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔ آج سے دس سال قبل احقر کو دیوبند کی حاضری کا موقع ہوا تو مولانا عبدالرشید علیہ الرحمہ کے یہاں ہی قیام رہا۔ اس موقع پر جامعہ امام محمد انور شاہ دیکھنے کا بھی شرف حاصل ہوا جہاں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ درس نظامی کی مکمل تعلیم عربی زبان میں دی جارہی ہے۔ دورانِ سبق افہام وتفہیم کی زبان خالص عربی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہاں زیر تعلیم طلبہ کی عربی زبان بہت اچھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عصری تقاضوں کے پیش نظر انگلش بھی سکھائی جاتی ہے۔ مولانا مرحوم اس ادارہ میں رہ کر حضرت علامہ سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے سایۂ شفقت میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ ادارہ کے قابل قدر وقیع مجلہ ماہنامہ ''محدّث عصر'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور حضرت علامہ سید انظر شاہ کشمیریؒ کے بعد ان کے صاحبزادۂ ذی وقار حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب کشمیری مدظلہٗ کے دست راست رہے۔ مولانا مرحوم کے عربی اور اردو مقالات مختلف جرائد ومجلّات میں شائع ہوتے رہے۔

احقر سے مولانا مرحوم کا تعلق قلبی اور بڑا مثالی تھا، چنانچہ متعدد بار پاکستان تشریف لائے تو قیام احقر کے ہی غریب خانہ پر رہا۔ ایک سفر میں تو حضرت علامہ انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے ہمراہ تشریف لائے تو بھی قیام کے لئے احقر کے غریب خانہ کو ہی ترجیح دی جو کہ مولانا مرحوم کی احقر کے ساتھ قلبی وابستگی کی دلیل ہے۔ یہاں شہر کراچی کے مختلف مدارس وجامعات میں مولانا کے بہت اچھے اور علمی بیانات ہوئے جن کی وجہ سے یہاں کے کافی لوگ مولانا مرحوم کو عقیدت ومحبت سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا نے احقر کی مسجد میں بھی کئی بار جمعہ کی نماز سے قبل بیان فرمایا جس سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا بحمد اللہ!

یہاں دیارِ سندھ میں چند قدیم تاریخی مقامات ہیں جہاں مولانا کے ہمراہ احقر کو بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ چناں چہ ''دیبل'' کا وہ تاریخی مقام، جہاں محمد بن قاسمؒ اپنی پوری جماعت سمیت کشتیوں سے اترے تھے اور پھر سندھ کے مغرور وظالم حکمراں راجہ داہر سے جنگ لڑی تھی، یہ ساحل ''دیبل'' کے مقام پر ہے جس کو اب ''بھنبھور'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا کے ساتھ اس مقام پر جانا ہوا، جہاں اب حکومت نے ایک تاریخی میوزیم بنادیا ہے جس کو دیکھ کر تاریخی مطالعہ کے کچھ گوشے عیاں ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ وہاں کے تاریخی احوال وواقعات اپنی یادداشت کی ڈائری میں جمع فرماتے

رہے۔ اندازہ یہ ہے کہ کم وبیش بیس سے پچیس صفحات کا مواد جمع کیا ہوگا مگر کم قسمتی یا قسمت کی ستم ظریفی کہئے کہ جب مولانا مرحوم یہاں سے حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ کراچی سے دہلی کی پرواز پر تشریف لے گئے تو دہلی ایئرپورٹ پر مولانا مرحوم کا وہ بیگ ہی نہیں مل سکا جس میں وہ تاریخی احوال پر مشتمل مواد اکٹھا کیا تھا۔ مولانا مرحوم کو اس کا بڑا افسوس بھی ہوا۔ بہرحال یہ بھنبھور کا تاریخی مقام حضرت مولانا مرحوم نے بڑی دلچسپی سے دیکھا، محمد بن قاسمؒ کے ہاتھوں تعمیر کی گئی طویل وعریض مسجد کی باقیات اور قلعہ بھنبھور کے کھنڈرات اور دیبل کا ساحل بڑی تسلی اور اطمینان کی کیفیت میں دیکھا، پھر ہم نے ٹھٹھ شہر کی شاہ جہانی مسجد دیکھی جو کہ شاہ جہاں بادشاہ نے تعمیر کروائی ہے، یہ بھی دہلی اور لاہور کی شاہی مسجدوں کی طرح شاہی مسجد ہے جو فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ ہم مولانا کے ساتھ ضلع ٹھٹھہ کے ایک تاریخی قصبہ میں گئے جہاں دیوبند کے روحانی آثار وانوار محسوس ہوتے ہیں جس کا نام ''سونڈہ'' ہے، یہاں کی جامع مسجد میں ایک حجرہ ہے جس میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے دورانِ سفر قیام فرمایا تھا، اسی بنا پر اس کے دروازہ کے اوپر ''حجرۂ شیخ الہند'' کی تختی لگی ہوئی ہے۔ یہاں دارالعلوم دیوبند کے چند فضلا آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل تشریف لائے تھے جو زمانہ کے اعتبار سے کچھ متقدم ومتاخر تھے، تاہم یہ سب لوگ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی یا پہلی نصف صدی کے علمائے کرام تھے، کیوں کہ ان حضرات کی جو اکابر دارالعلوم سے مکاتبت ومراسلت ہوئی اس کے خطوط اور تحریریں تاہنوز محفوظ ہیں جنہیں راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ ان خطوط میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اور حضرت شیخ الہند اور بعد کے مشائخ واکابر کے خطوط، ان کے دستخطوں کے ساتھ ہیں، اس حجرہ اور مسجد میں واقعتاً اللہ والوں کے انوار وبرکات محسوس ہوتے ہیں، اس قصبہ سے ملحقہ قبرستان میں ایسے آثار نمایاں ہیں جو اسلام کی ابتدائی صدیوں کی علامات معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالرشید صاحب کے ہمراہ ہی اس قبرستان میں جا کر دیکھا تو قبروں میں لگے ہوئے پتھروں، نیزوں، تلواروں اور ڈھال کے نقوش کنداں ہیں جنہیں دیکھ کر ماہرین آثارِ قدیمہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ قبرستان اور اس سے ملحقہ میدان محمد ابن قاسم ثقفیؒ اور راجہ داہر کے مابین برپا ہونے والے ایک معرکہ کی جگہ اور میدان ہے اور اس میں شہید ہونے والے لوگ یہاں مدفون ہیں۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ جہادی معرکوں میں شہید ہونے والوں کی قبروں پر آلاتِ حرب کے نقش کندہ کر دیئے جاتے تھے۔

مولانا عبدالرشید بستویؒ کے ہمراہ اندرونِ سندھ کے ایک قدیم شہر نصرپور جانا ہوا، جہاں احقر پہلے بھی جا چکا تھا، مگر مولانا مرحوم کی معیت میں جا کر ایک علمی فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ نصرپور وہ تاریخی شہر ہے جہاں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں چار سو محدثین تھے۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے فقہاء اور

علما بھی گذرے ہیں۔ ان میں سے کئی حضرات اصحابِ تصانیف بھی ہیں، یہ بات مولانا مرحوم کے ذریعے معلوم ہوئی اور مزید ایک بات یہ بھی مولانا نے تاریخی حوالوں سے بتائی کہ نصرپور ہی وہ جگہ ہے جہاں ہاتھوں سے وہ ٹائلس بھی تیار کی جاتی ہیں جو کہ ہندو پاک وایران اور دیگر اسلامی ریاستوں میں بنی ہوئی تاریخی عمارات میں استعمال ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ ٹھٹھہ کی شاہی مسجد میں جو ٹائلس نیلی وسفید رنگت والی لگی ہوئی ہیں وہ ساری اسی نصرپور کی بھٹیوں میں تیار ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے میزبان مولانا ڈاکٹر تاج محمود وقاص صاحب کے ساتھ ایک بھٹی دیکھنے کے لئے گئے جہاں یہ ٹائلس تیار ہوتی ہیں۔ بھٹی والے نے خاطر داری کرتے ہوئے ہمیں ایسی دو ٹائلس ہدیہ میں پیش کیں جن میں سے ایک پر لفظ ''اللہ'' اور دوسری پر لفظ ''محمد'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ٹائلس سازی کی صنعت نصرپور میں صدیوں پرانی صنعت ہے، یہاں سے کئی ممالک میں یہ ٹائلس جاتی ہیں اور زمانہ ماضی میں بھی جاتی تھیں۔

یہ چھوٹا سا شہر نصرپور عہدِ رفتہ کی ایک یادگار اور ہمارے اسلامی علوم وفنون کی عظمت وبرتری کی پرانی تصویر ہے جس میں اگر ہم غور وخوض کریں تو بہت ساری علمی تحقیقات کے گوشے عیاں ہوں گے۔ میں نے مولانا عبدالرشید صاحبؒ کو وہاں پہنچتے ہی یہ کہا کہ مولانا! یہاں کی زمین کا پانی بہت شاندار، شیریں اور شفاف ہے۔ یہ بات ایک مجلس میں ہوئی تو نصرپور کے ہمارے میزبان ڈاکٹر مولانا تاج محمود نے قاضی صاحب سے بتایا کہ جے پور کے راجہ مان سنگھ کے پینے کے لئے پانی یہیں نصرپور سے سواریوں پر لے جایا جاتا تھا۔ میں نے اس پانی کی شیرینی اور شفافیت کا سبب جاننے کے لئے سوال کیا تو بتایا گیا کہ دریائے سندھ کسی زمانے میں یہیں سے گذرتا تھا جہاں اب نصرپور کی آبادی کا بڑا حصہ آباد ہے۔ رفتہ رفتہ دریا نے اپنا راستہ کافی دور کرلیا ہے جو کہ دریائی بہاؤ کے لئے قدرتی عمل ہوتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالرشید صاحبؒ کو اندرون سندھ کی کچھ مزید تاریخی جگہوں کو دیکھنے کا شوق تھا تو ہم نے ایک دن مولانا کے ساتھ لمبے سفر کا پروگرام بنایا، چنانچہ ہم کراچی سے چل کر نوشہرہ فیروز ضلع کے ایک شہر کنڈیارو پہنچے جہاں دو جلیل القدر علمی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی، حضرت مولانا محمد قاسم سومرو اور ان کے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر محمد ادریس سومرو جو کہ آج کل اسلامی نظریاتی کونسل آف پاکستان کے ممبر ہیں۔ ایک رات ہم نے ڈاکٹر سومرو صاحب کے گھر پر قیام کیا اور ان کے والد ماجد مولانا قاسم سومرو صاحب مدظلہٗ کے گھر قائم ان کی ذاتی لائبریری دیکھی، جس میں ہزاروں کتب ورسائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر سومرو نے بتایا کہ انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے لئے ۱۹۴۷ء سے لے کر مقالہ لکھنے کے زمانہ غالباً ۲۰۰۰ء تک کے سندھی زبان میں جتنے رسائل شائع ہوئے ہیں سب کا ذخیرہ اکٹھا کیا جن کی تعداد پانچ

ہزار سے زائد ہے، یہ لائبریری قاسمی لائبریری کے نام سے موسوم ہے جس سے کافی اہل تحقیق و ریسرچ استفادہ کرتے ہیں۔

ہم دوسرے دن صبح کو ناشتہ کرکے شکارپور اور پھر اسکے آگے شہداء کوٹ ''سیرت لائبریری'' کی زیارت کے قصد سے نکلے، سکھر سے جب شکارپور کے راستہ پر گامزن ہوئے تو کچھ دیر بعد ایک مقام آیا جہاں مولانا ادریس سومرو صاحب نے مولانا عبدالرشید بستویؒ کو بتایا کہ اس مقام پر ہم کچھ دیر رکنا چاہتے ہیں کیوں کہ یہاں چند قبریں ہیں جن کے بارے میں اہل علم لوگوں میں معروف ہے کہ یہ حضرات صحابہ کرامؓ کی قبریں ہیں مگر ان کے نام صراحت کے ساتھ ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ گاڑی سے اترے اور ان پانچ قبروں کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ مزید قبریں بھی تھیں، جو ان کے خاندان کے دیگر افراد کی قبریں بتائی جاتی ہیں، بالکل ہی سادہ کی جگہ دائیں بائیں جنگلی درختوں کی موجودگی عجیب سی وحشت ناکی کا نقشہ کھینچ رہی تھی، مگر سچ یہ ہے کہ اس جنگل میں بھی ان نیک نفوس قدسیہ کی موجودگی کے سبب بڑے انوارات محسوس ہوئے، وہاں ہم کچھ دیر فاتحہ خوانی کرنے کے بعد شکارپور کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ بھی پاکستان کا ایک معروف مگر چھوٹا سا شہر ہے، یہاں کی کوئی قابل ذکر خاص چیز نہیں معلوم، البتہ یہاں اچار سازی کی صنعت پورے ملک میں مشہور ہے۔ چنانچہ درجنوں قسم کے اچار یہاں پائے جاتے ہیں جن میں گوشت کا اچار، مچھلی کا اچار اور تمام ہی اقسام کی سبزیوں کے اچار یہاں بنائے جاتے ہیں۔ بہرحال آگے چل کر ہم لوگ عصر کے قریب شہداء کوٹ پہنچے، ''سیرت لائبریری'' کے قریب ہی مسجد میں نماز ادا کی گئی، پھر سیرت لائبریری میں داخل ہوئے، یہ لائبریری بھی قاسمی لائبریری کے برابر یا اس سے کچھ بڑی ہوگی، اس کی خاص بات کتب سیرت کا ذخیرہ ہے۔ چنانچہ لائبریری کے مالک نے ہندو پاک سے شائع ہونے والی سیرت پاک پر ہر کتاب بلا امتیاز مکتب فکر اپنے اس ذخیرہ میں اکٹھا فرمائی ہوئی ہے۔ مولانا عبدالرشید صاحبؒ کا تعارف ڈاکٹر ادریس سومرو نے کرایا تو اتفاق سے ''رجال السند والہند'' کا ترجمہ جو مولانا نے کیا ہے اور احقر کے ادارہ سے شائع ہوا ہے، وہ بالکل قریب ہی رکھا ہوا تھا، تو مالک سیرت لائبریری مولانا کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔

احقر کے لئے یہ معلوماتی سفر مولانا عبدالرشید صاحبؒ کی برکت سے ہوا، وقت کی کمی تھی، ورنہ اندرون سندھ کی کچھ قدیم تاریخی جگہیں بھی مولانا دیکھتے جاتے، مگر مولانا فرماتے کہ چلیں بقیہ مقامات کی زیارت انشاءاللہ آئندہ سفر میں کریں گے۔

مولانا مرحوم نے احقر کی خواہش پر ''رجال السند والہند'' کا ترجمہ فرمایا، اسی طرح شیخ عبدالفتاح

ابوغدہؒ کے ایک رسالہ کا ترجمہ ’’اسلامی آدابِ زندگی‘‘ کے نام سے فرمایا، یہ دونوں احقر کے مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ اور روزنامہ کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا کی تالیف ’’امثال ومحاورات‘‘ عربی اردو، اسی طرح ’’درحدیث دیگراں‘‘ بھی شائع ہوکر مقبولیت پا چکی ہیں۔ مولانا کی چند کتب احقر کے پاس کمپوز شدہ طباعت کے لئے تیار صورت میں موجود ہیں، انشاء اللہ ان کو بھی شائع کیا جائے گا۔ ان میں ’’امثال ومحاورات‘‘ اردو سے اردو، اور ’’شہر رسول‘‘ شامل ہیں۔ ان کتب ومسوادات کے تذکرہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا مرحوم کا احقر سے کیا سچا اور علمی ذوق کا تعلق تھا۔

یہاں شہر کراچی میں مولانا عبدالرشیدؒ سے محبت وعقیدت کا تعلق رکھنے والے حضرات کافی سارے ہیں، ان میں سے چند قابل ذکر شخصیات یہ ہیں: حضرت الاستاذ مولانا مفتی عبدالرؤف خان غزنوی صاحب مدظلہٗ جو کہ مولانا عبدالرشید صاحبؒ کے زمانۂ تدریس دارالعلوم میں خود بھی مدرس تھے، یہاں دورانِ سفر مولانا مرحوم سے بڑی محبت اور شگفتہ مزاجی کا برتاؤ فرمایا، گھر پر کھانے کی دعوت اور ہدیہ وتحفہ کی صورت میں شفقت ومحبت کا اظہار فرمایا۔ جب حضرت غزنوی صاحب مدظلہٗ کو مولانا مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر ملی تو بڑی افسردگی اور رنج وغم کی حالت محسوس کی اور کافی دیر تک مولانا مرحوم کا تذکرہ فرماتے رہے۔ یہاں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علاقہ بنوری ٹاؤن میں بخاری شریف ج/ ۲ کا سبق پڑھاتے ہیں، حضرت نے سبق کے دوران طلبہ کے سامنے مولانا مرحوم کا متعدد بار تفصیل سے ذکر کیا اور ان کے لئے طلبہ کے ساتھ ایصالِ ثواب اور دعاء مغفرت کا اہتمام فرمایا۔ واضح رہے کہ کراچی کی مقتدر دینی درسگاہوں میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ دورۂ حدیث شریف میں تقریباً سات سو طلبہ ہوتے ہیں، اس کے بانی ومؤسس علامہ محمد یوسف بنوری، صاحب ’’معارف السنن‘‘ ہیں جو کہ علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں۔

اسی طرح جناب حضرت قاری عبدالستار صاحب محمود کوٹی مدظلہٗ بھی مولانا مرحوم سے بڑا قلبی اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف شعبۂ حفظ وتجوید میں مہارت تامہ کے علاوہ حفظ وناظرہ اور قاعدہ کے شعبوں میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی محنت بہت شاندار طریقہ سے کر رہے ہیں۔ چنانچہ موصوف نے تحفۃ المدرسین، تجوید کی اہمیت اور فیض رحمانی یعنی طریقۂ تدریس قاعدۂ نورانی جیسی بیش قیمت کتابیں تالیف فرمائی ہیں اور ان پر مولانا مرحوم کے قلم سے تقاریظ موجود ہیں۔ قاری صاحب تجوید وقراءت کی اہمیت، تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ تربیت کا بڑا عمدہ اور طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ مختلف مدارس وجامعات، تدریبی دورہ جات کا اہتمام فرماتے ہیں، جن سے مدرسین کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ آج کل حضرت مولانا محمد یوسف

لدھیانوی شہیدؒ کی مسجد خاتم النبیین میں تدریس وتربیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔مولانا کے انتقال کی خبرسن کر حیرت وافسوس کی گویا تصویر بن گئے اور بتانے لگے کہ مولانا مرحوم سے میری ہرمہینہ تقریباً ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی تھی۔ قاری صاحب نے اپنے مدرسہ میں اور تلامذہ سے ان کی درسگاہوں میں مولانا مرحوم کے لئے قرآن کریم پڑھوا کر ایصال ثواب کا اہتمام کیا اور دیگر تلامذہ سے بھی کرایا، ہمارے ادارہ میں بھی مولانا کے ایصال ثواب کے لئے قرآن کی تلاوت اور دعاء کا اہتمام کیا گیا۔

مولانا مرحوم کی معیت میں ایک علمی لطیفہ اس وقت سننے اور دیکھنے کا موقع ہوا جب کہ راقم الحروف مولانا کو ایک بڑے عالم دین، مفسر قرآن ومحدّث ذی شان سے ملاقات کرانے لے گیا تو مولانا نے مذکورہ عالم دین بلکہ علامہ صاحب سے دورانِ گفتگو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جی ہاں حضرت علامہ کشمیری سیرت وسوانح پر ایک کتاب احقر نے لکھی ہے جس کا نام ''علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ہشت پہلو شخصیت'' ہے۔تو وہ علامہ صاحب بول پڑے کہ ہشت پہلو کے بجائے درست تعبیر ''ہشت جہت'' ہے۔مولانا مرحوم نے پلٹ کر جواب دیا کہ حضرت اردو لغت میں ''ہشت پہلو'' ہی درست ہے نہ کہ ''ہشت جہت'' مگر علامہ صاحب نے اس کو تسلیم نہ کیا، وہ بزعم خویش اردو دانی میں مہارت رکھتے ہیں، حالاں کہ وہ صاحبِ زبان بھی نہیں ہیں بلکہ پشتو زبان والے ہیں، خیر ہم اس ملاقات سے فارغ ہوکر رات کو واپس آ گئے۔مولانا کا قیام احقر کے آفس میں تھا جہاں ٹیلی فون لگا ہوا تھا، جب صبح ہم نے فجر کی نماز ادا کر لی تو احقر نے فیروز اللغات اردو میں ''ہشت پہلو'' کی تعبیر دیکھی تو وہاں درج تھی لیکن ''ہشت جہت'' والی تعبیر قطعی طور پر نہیں ملی تو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ رات کو جو علامہ صاحب اپنی اردو دانی پر ناز کرتے ہوئے ''ہشت جہت'' والی تعبیر کی درستگی پر مصر تھے حالاں کہ ان کی تعبیر تو اردو لغت میں ہے ہی نہیں۔تو مولانا نے بتایا کہ رات واپس آتے ہی میں نے لغت میں یہ تعبیر دیکھ کر علامہ صاحب کو رات ہی فون کر دیا تھا کہ درست تعبیر ''ہشت پہلو'' ہی ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کیوں کہ علامہ صاحب اصلی پٹھان اور گرم مزاج والے ہیں، عام طور پر ان سے لوگ بے تکلف بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے مگر مولانا عبدالرشید صاحبؒ نے ان علامہ کو قائل وقانع کر کے چھوڑا۔

مولانا مرحوم کے لئے یہاں اندرونِ سندھ اور پنجاب کے مختلف مدارس میں دعاؤں اور ایصالِ ثواب کا سلسلہ رہا اور کئی لوگ تعزیت کے جذبے سے احقر سے فون پر رابطہ کرتے رہے۔ چند بار مولانا نے پاکستان آ کر محبتوں کی وہ سوغات لوگوں میں تقسیم فرمائی کہ یہاں دورانِ قیام اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہوتا تھا اور مولانا بھی اپنائیت محسوس کرتے تھے۔مولانا کے ایک ہم سبق اور بے تکلف دوست بھی ایک

مدرسہ کے مدیر و مہتمم ہیں جنہوں نے دورۂ حدیث مولانا کے ساتھ ہی دارالعلوم دیوبند سے کیا ہے، وہ مولانا اسعد زکریا قاسمی صاحب ہیں۔ موصوف بھی مولانا کے انتقال سے بڑے غمزدہ ہوئے اور اپنے مدرسہ میں ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا۔ اسی طرح ایک برمی نژاد فاضل دیوبند بھی مولانا کے درسی ساتھی یہاں کراچی میں ہی مقیم ہیں اور ایک مدرسۃ البنات چلا رہے ہیں اور دیگر مدرسہ میں تدریس فرماتے ہیں، ان کا نام نور حسین قاسمی ہے۔ موصوف نے بھی بڑے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گراں قدر دعاؤں سے مولانا مرحوم کو یاد کرتے رہے۔

مولانا مرحوم کی شخصیت، سادگی، سنجیدگی، متانت کے ساتھ خوش طبعی اور ہمہ وقت علم دوستی سے عبارت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ہمہ جہت علمی و قلمی مشغولیات کے تناظر میں اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ صحافتی خدمات، ترجمہ وتالیف کے کام کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں میں دروس و مواعظ کا سلسلہ بھی قائم رکھتے تھے۔ کئی مدارس و جامعات کے مشیر وایڈوائزر کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ بہرحال اللہ رب العزت نے مولانا مرحوم سے علمی حلقوں میں بڑا گراں قدر کام لیا ہے اور احقر یہ امید کرتا ہے کہ مولانا کے علمی و قلمی کارنامے اور خدمات ان کے لئے عظیم صدقۂ جاریہ ہیں اور آخرت کے لئے بہترین ذخیرہ ہیں۔ ملک و بیرون ملک پھیلے ہوئے مولانا کے سیکڑوں تلامذہ بھی ان کا عملی سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں احقر دست بدعا ہے کہ وہ اپنی شانِ کریمی کے صدقہ مولانا مرحوم کو بھرپور اعزاز و اکرام سے نوازے اور تمام تر صغائر و کبائر کو معاف فرما کر رفع درجات سے ہم کنار فرمائے اور آخرت کی تمام منازل میں کامرانی وسرخروئی عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان بالخصوص اہل خانہ اور تمام اعزہ واقرباء کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

۞۞۞

# مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ

## چند یادیں چند باتیں

مفتی عبیدانور شاہ قیصر
استاذ جامعہ ہذا

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ (1966ء–2018ء) کو پہلی بار کب دیکھا یہ تو یاد نہیں، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں مولانا کو کئی مرتبہ دیکھنے اور سننے کا خوب موقع ملا۔ یہ موقع اکثر خانگی مجلس میں میسر آیا، جس کی شکل یہ پیش آئی کہ عرصۂ دراز تک مولانا مرحوم مع چند دیگر علماء واساتذہ ہفتہ دس دن کے دورانیہ میں دو تین دن پابندی کے ساتھ بعد والد محترم (مولانا نسیم اختر شاہ قیصر) سے ملاقات کے لئے گھر پر تشریف لاتے۔ مولانا بستویؒ کے ساتھ دارالعلوم وقف دیوبند اور جامعہ امام انور کے چند دیگر اساتذہ ہوتے۔ ان حضرات کی آمد پر پانی، چائے اور حسبِ موسم وخواہش دیگر مشروبات مع لوازمات پہنچانے کا کام میرے ذمہ تھا۔ بڑوں کی مجلس میں باقاعدہ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن برتن لانے اور بعد فراغت واپس لے جانے اور اس کے درمیانی وقفہ میں بیٹھنے کا بہانہ وموقع مل جاتا۔ مجلس جمتی تو شرکاء کے درمیان دینی، علمی، تاریخی، سیاسی، ملکی وعالمی موضوعات اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا اور کئی دیگر امور زیرِ بحث آتے۔ چونکہ ان حضرات کا مطالعہ اور دلچسپی کا تعلق متعدد علوم سے تھا، اس لئے عطر کی طرح کشید کیا ہوا منتخب اور متنوع معلومات کا کچھ حصہ اس سراپا جہل کے دامنِ طلب تک پہنچتا رہتا۔ اس کے بعد جون ۲۰۱۷ء میں میرا تقرر بحیثیت استاذ جامعہ امام محمد انور شاہ میں ہوا، مولانا عبدالرشید صاحبؒ جامعہ کے سینئر استاذ ہونے کے ساتھ ناظم تعلیمات بھی تھے۔ اس لئے دفترِ تعلیمات میں تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی۔ اب ملازمت کے بعد بڑے اور چھوٹے کا حجاب پہلے جیسا نہیں رہا تھا، شریکِ مجلس ہونے کی حیثیت سے میں بھی اپنے ناقص مطالعہ کا خیال واحساس رکھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیتا۔ اس مرحلے میں مولانا عبدالرشید صاحبؒ کی ایک خوبی مجھ پر ظاہر ہوئی کہ مولانا کو صرف بولنے اور اپنی بات سنانے کا

عالمانہ مرض نہیں تھا، بلکہ دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دیتے اور توجہ سے ان کی بات سنتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے کوئی بات کہی جس سے مولانا کو اتفاق نہیں تھا مگر انہوں نے درمیان میں میری بات نہیں کاٹی بلکہ اس کے مکمل ہونے تک خاموش رہے۔ پھر بعد میں اپنی رائے اور سوچ کو واضح کیا اور اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ یہ ان کی بڑی خوبی تھی ورنہ کچھ بڑوں کے بڑے پن کا لازمہ اور خاصہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بس خاموشی سے سنئے اور سنتے رہئے۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ مولانا نے کبھی بھی اپنی گفتگو کو گھٹیا تبصروں اور سطحی زبان سے آلودہ نہیں کیا۔ واقعات واشخاص پر وہ حسبِ ضرورت خوب تبصرہ کیا کرتے تھے اور اپنے مطالعہ کی رو سے جب کسی بات کو خلاف حقیقت سمجھتے تو اس کی تردید و تغلیط میں پوری قوت صرف کر دیتے لیکن اس میں بھی زبان کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتے اور اپنے عالمانہ وقار کا بخوبی لحاظ رکھتے۔ معاصرین وہم پیشہ احباب جب ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو بسا اوقات مجلس میں ایک دوسرے پر طنز اور چوٹ بھی ہوا کرتی ہے، کچھ لوگ اس میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں، تبصرہ کرنے یا ان پر کوئی اور تبصرہ کرے تو اس کے ردِعمل میں نامناسب طرز اختیار کرتے ہیں۔ ذرا سی بات کو کبھی ہتکِ عزت پر محمول کر بیٹھتے ہیں اور بلا سبب بدگمانی اور نفرت اپنے دل میں پالنے لگتے ہیں۔ مولانا بستویؒ ان دونوں خرابیوں سے محفوظ تھے، کبھی کبھی وہ خود بے تکلفانہ تبصرہ کرتے مگر اخلاق کے دائرے میں اور جب کوئی ان پر تبصرہ کرتا تو ان کی رواداری، صبر وضبط اور خوش مزاجی دیکھنے سے تعلق رکھتی۔

میری ابتدائی تعلیم از عربی اول تا درجہ عربی سوم معہدِ انور (جامعہ امام محمد انور شاہ کا قدیم نام) میں ہوئی۔ مولانا عبد الرشید صاحبؒ یہاں ابتدا ہی سے تدریسی خدمت سے وابستہ تھے مگر گھنٹوں کی ترتیب و تقسیم کچھ اس طرح تھی کہ ان تین سالوں میں مولانا مرحوم سے پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے عربی تعلیم کے آغاز سے پہلے عصری تعلیم کا کچھ مرحلہ بھی طے کیا تھا اور سائنس سائڈ سے انٹر کرنے کے بعد گویا کہ خراباتیانِ خرد باختہ کی محفل سے اٹھ کر اہلیانِ دانشِ فردہ وصاحبانِ دلِ تابندہ کی مجلس میں آیا تھا۔ ایسے میں اس بات کا امکان تھا کہ ماحول، کتب ومضامین اور اسلوبِ تدریس کی فوری ویکسر تبدیلی کی بنا پر درسگاہ میں کتابیں سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے، اس لئے والد محترم نے مولانا بستویؒ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خارجی وقت میں مجھے عربی کی کوئی ابتدائی کتاب پڑھا دیں، اگر کمی ہو تو اس کی تلافی ہو جائے۔ میرا داخلہ عربی اول میں ہوا تھا اور معہدِ انور میں اس سال سے پہلے ایک سال اعدادیہ کا تھا، جس میں فارسی، ابتدائی دینیات کے ساتھ القراءۃ الواضحۃ کا پہلا حصہ داخل تھا، اور پھر عربی اول میں اس کا دوسرا حصہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا بستویؒ نے القراءۃ الواضحۃ حصہ اول پڑھانے کے لیے

حامی بھر لی۔ بتائے ہوئے وقت پر میں پابندی سے مولانا کے یہاں جاتا رہا لیکن ایک ہفتہ بلکہ دس دن گزر گئے سبق کی نوبت نہیں آئی۔ مختلف مصروفیات اور اعذار کی بنا پر مولانا روز ہی معذرت کر لیتے اور میں گھر لوٹ آتا۔ قصہ مختصر خارجی طور پر بھی مولانا سے استاذ شاگرد کا تعلق قائم نہیں ہو سکا۔ یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ مولانا مرحوم کی تدریس سے متعلق کوئی بات میں ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں نہیں کہہ سکتا، البتہ مولانا کی زندگی میں اور اب دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد بھی، ان سے پڑھنے والے طلبہ سے (جن میں بعض میرے قریبی ساتھی ہیں) جب کبھی اس حوالہ سے بات ہوئی تو سب نے تعریفی کلمات ہی سے مولانا کا ذکر کیا۔ دوست واحباب کس حد تک بے تکلف ہوتے ہیں، سب جانتے ہیں اور اس بے تکلفی میں ہر شخص بے دریغ اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتا ہے، جس کی بنا پر ایک شخص کے بارے میں ہر نوع کی اور کئی بار متضاد آراء سننے کو ملتی ہیں۔ مولانا مرحوم ان اساتذہ میں سے تھے جن کی تدریس کے حوالے سے کبھی کوئی ہلکی بات سننے میں نہیں آئی۔ ابتدائی کتابیں ہوں یا دورۂ حدیث کی منتہی کتابیں جس نے مولانا سے جو پڑھا اسے ان کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ ان کے ہر شاگرد کو ان کی کتابی صلاحیت، افہام وتفہیم کے سلیقہ، متعلقہ مضمون پر مکمل گرفت اور دورانِ درس علمی متانت کا گرویدہ پایا۔

مولانا بستویؒ نے عربی زبان وادب کی تعلیم مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی تھی، جنہیں عربی زبان کا فطری ذوق اور اس کی تدریس کا خداداد ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ ان کی تدریس کے بارے میں زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، ان کے فیض یافتہ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد عرصہائے دراز سے ملک و بیرون ملک میں مختلف جہتوں سے عربی زبان کی غیر معمولی خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ زندہ وتابندہ آثارِ باقیات ہی مولانا کی عظمتِ شان کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ مولانا بستویؒ بھی ہمیشہ اس بات کا اظہار واعتراف کیا کرتے تھے کہ عربی زبان سے ان کی دلچسپی اور اس میدان میں ان کی لیاقت مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہی نگاہِ فیض رساں کا کرشمہ تھی۔ عربی زبان کی تعلیم وتدریس بعض دیگر زبانوں کے مقابلے کچھ مشکل سمجھی جاتی ہے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ مشکل منہجِ تدریس اور اسلوبِ تعلیم کی پروردہ ہے۔ ہمارے یہاں زبان کو بحیثیت زبان نہ پڑھا کر، فقہی عبارتوں کی طرح حل کرایا جاتا اور عملی مشق کے بجائے قواعد رٹوانے اور غیر ضروری لغات حفظ کرانے پر ساری محنت صرف کی جاتی ہے۔ یہ مولانا کیرانویؒ کا تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے مدارس کے لگے بندھے نظام سے بلند ہو کر عربی زبان کے گلشنِ تدریس میں نئے گل بوٹوں کی آبیاری کی۔ مولانا کیرانویؒ کی تدریس کے سلسلے میں ان کے شاگردوں نے جو باتیں ذکر کی ہیں ان میں یہ بات غیر معمولی ہے کہ ان کی تدریس درسگاہ تک محدود نہیں

تھی، بلکہ وہ جس طرح درسگاہ میں بے پناہ شوق و ذوق کے ساتھ اپنے منفرد اندازِ تدریس سے علم و ادب کے موتی لٹاتے تھے، اسی طرح درسگاہ سے باہر بھی ان کی شانِ معلّمی جلوہ گر رہتی تھی۔ درسگاہ سے باہر، دارالعلوم کے احاطے میں چلتے پھرتے، گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر کی طرف آتے جاتے، طلبہ کے ساتھ گھر پر مجلس میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ان کی تدریس جاری رہتی تھی۔ راستہ میں چوراہے پر پہنچتے تو ساتھ چل رہے طلبہ سے پوچھتے کہ چوراہے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟ کوئی طالب علم بتا دیتا تو ٹھیک، ورنہ خود بتا کر اسی آمد و رفت میں دو تین جملوں میں اس کی مثال دے دیتے۔ کسی طالب علم کے ہاتھ میں کوئی سامان دیکھتے تو اس سے اس کی عربی دریافت کرتے، اور پھر اسے وہیں وہ لفظ مع استعمال سمجھا دیتے۔ یہ مشاہدہ اور محسوس مثالیں طلبہ کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتیں اور ان کا طریقۂ استعمال بھی یاد ہو جاتا۔ یہ خاص انداز تو مولانا کیرانویؒ کے ساتھ رخصت ہو گیا، البتہ درسگاہ کی حد تک ان کے کئی باتوفیق تلامذہ نے ان کے اسلوبِ تدریس کی محاکات کا سلسلہ قائم رکھا۔ مولانا بستویؒ بھی اپنے استاذ کے طریقۂ تدریس کے پابند رہے اور اس میں کمال پیدا کیا۔ جامعہ امام محمد انور میں مولانا نے برسوں عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں، مولانا کا درس کچھ اس قسم کا تھا (جو مولانا کیرانویؒ کے اسلوب تدریس سے مستعار تھا) کہ وہ طلبہ کو چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعہ عربی قواعد کی بکثرت مشق کرا دیتے اور عربی لب و لہجہ میں ان جملوں کے تکلم پر بھی خوب محنت کراتے۔ القراءۃ الواضحۃ کا ایک سبق عموماً ایک یا دو صفحہ کا ہے، مولانا کے یہاں یہ ایک سبق ایک ہفتے میں مکمل ہوتا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ درسگاہ کے ہر طالب علم سے تحریری و زبانی مشقیہ جملے بنوائے اور سنے جاتے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا سے ابتدا میں پڑھنے کا جن طلبہ کو موقع ملا انہیں کبھی نحوی و صرفی غلطی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عربی زبان کے قواعد کی باضابطہ تعلیم سے قبل ہی موٹے موٹے بنیادی قواعد جو عبارت خوانی کے لیے کفایت کر جاتے ہیں، وہ طلبہ کے زبان و قلم پر جاری ہو جاتے۔ ہمارے کئی احباب اس بات کے معترف ہیں کہ مولانا سے پڑھی ہوئی القراءۃ الواضحۃ سے جتنا عملی فائدہ ہوا اتنا دیگر اساتذہ سے پڑھی ہوئی ہدایۃ النحو اور کافیہ سے نہیں ہوا۔

مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ نے ابتداءً دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں پڑھایا، پھر کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد جامعۃ القرآن الکریم جھنڈاپور، بجنور چلے گئے، یہاں بھی مولانا کا قیام طویل نہیں ہوا، یہاں سے علیحدہ ہو کر مرکز المعارف آسام کی دیوبند شاخ سے منسلک ہو گئے اور مختلف کتابوں کی تالیف و ترجمے کا کام کیا، پھر ۱۴۲۱ھ میں آپ کا تقرر بحیثیت استاذ عربی ادب دارالعلوم دیوبند میں ہو گیا، جہاں بہت کم عرصے میں آپ کی تدریس کو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی، مگر افسوس کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر مولانا

کو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ دارالعلوم دیوبند اپنی مرکزیت، مرجعیت و محبوبیت کے لحاظ سے بلاشبہ ام المدارس کی حیثیت رکھتا ہے، اس ادارے سے علیحدگی مولانا کے لیے کسی عظیم سانحہ سے کم نہیں تھی۔ مولانا بڑے دلبرداشتہ ہوکر دیوبند کو الوداع کہنے کی مکمل تیاری کر چکے تھے کہ دستِ غیب نے ان کو سہارا دیا اور حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ جیسی قدر شناس و قدر دان ذات تک انہیں پہنچا دیا۔ ''قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' کے بموجب حضرت شاہ صاحبؒ نے چشم زدن میں مولانا بستویؒ کی علمی لیاقت کو پہچان لیا اور بلا تامل ان کو معہدِ انور میں تدریس اور اس کے شعبہ تصنیف و تالیف میں خدمت کے لیے منتخب کرلیا۔ مولانا بستویؒ نے تاعمر شاہ صاحب کے اس احسان کو یاد رکھا اور ان سے کسی سابقہ تعلق یا رشتۂ تلمذ نہ ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ہمیشہ احترام و شیفتگی کا معاملہ کیا۔ قربت بڑھی تو مولانا بستویؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت کے جمال و کمال کے قتیل ہوکر رہ گئے۔ ان کی علمیت، فکر و نظر کی وسعت و گہرائی، سیاسی بصیرت، حق گوئی، انتظامی صلاحیت، خورد نوازی جیسے نایاب اوصاف کے گرویدہ بن گئے۔ شاہ صاحبؒ نے بھی ان پر اسی درجہ اعتماد کا اظہار کیا اور معہدِ انور کی کئی اہم ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیں۔ معہد کے تعلیمی و تربیتی فیصلوں میں ان کو بھی مشورہ میں شریک کرتے اور ان کی باتیں توجہ سے سنتے۔ شاہ صاحبؒ کی عادت تھی کہ کسی کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ کسی میں کوئی علمی یا عملی خوبی دیکھتے تو مختلف مواقع پر اس کا تذکرہ کرتے۔ مولانا بستویؒ کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے بارہا فرمایا کہ ''بھائی! عبدالرشید ترجمہ کا آدمی ہے'' اور صرف کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے والد بزرگوار حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی کئی کتابوں کی تعریب کا کام ان کے سپرد کردیا۔ مولانا بستویؒ نے خوب توجہ، محنت اور جاں فشانی کے ساتھ علامہ کشمیریؒ اور ان کے علوم سے متعلق تین کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں سے دو معہدِ انور (جامعہ امام محمد انور) ہی سے شائع ہوکر اہلِ علم کے درمیان مقبول ہوئیں۔ اور ایک کتاب ابھی طبع نہیں ہوسکی۔ ان تین کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) خاتم النبیین (فارسی سے عربی ترجمہ) مطبوعہ

(۲) نوادراتِ امام کشمیری (اردو سے عربی ترجمہ) بنام ''مختارات الامام الکشمیری''۔ مطبوعہ

(۳) ملفوظاتِ محدث کشمیری (اردو سے عربی ترجمہ) غیر مطبوعہ

ترجمہ کا یہ کام انجام دیتے ہوئے مولانا بستویؒ کو علامہ کشمیریؒ کی تصنیفات بنظرِ غائر پڑھنے کا موقع ملا اور محدود دائرہ میں سہی علومِ انوری سے ان کا ایک گونا تعلق قائم ہوگیا تھا جو اس زمانۂ انحطاط و زوال میں بڑی بات ہے۔ اس کے علاوہ علامہ کشمیریؒ کی بخاری شریف کی تقریر ''انوار الباری'' مرتبہ مولانا سید احمد

رضا صاحب بجنوریؒ کے تکملہ کا آغاز کیا۔ یہ کام کتاب الزکوۃ سے شروع ہوا مگر مولانا کی تدریسی وانتظامی مصروفیات مسلسل حائل ہوتی رہیں اور کام آگے نہیں بڑھ سکا، اور ایک جلد بھی مکمل نہ ہوسکی۔ مولانا بستویؒ نے علامہ کشمیریؒ کی مختلف سوانح عمریوں کو سامنے رکھ کر ایک مختصر کتاب بھی تالیف فرمائی، جس کا نام ''علامہ انور شاہ کشمیری، اپنی ہشت پہلو شخصیت کے آئینے میں'' ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ مولانا نے مختلف جگہوں سے انتخاب فرما کر کئی اہم چیزیں اختصار کے ساتھ یکجا کردی ہیں، سب باتیں باحوالہ لکھی ہیں، اور اصل مصادر کی نشان دہی صفحہ نمبر کے ساتھ کی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو علامہ کشمیری کی شخصیت سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے، اور ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، وہ اس کتاب کی مدد سے کم وقت میں ان کی حیات وخدمات کے کئی پہلوؤں سے باخبر ہوسکتے ہیں۔

مولانا نے عربی اور اردو کی کئی دیگر کتابوں کی بھی خدمت کی، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

اردو سے عربی ترجمہ:

(۱) حیات شیخ الہند، از: حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں دیوبندیؒ۔ (۲) الاسلام، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ (۳) رمضان کے روزے، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ (۴) اسلام میں مرتد کی سزا، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ (۵) انسان اور انسانیت، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ (۶) قربانی کا فلسفہ، از: حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ (۷) العقل والنقل، از: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔

عربی سے اردو ترجمہ:

(۱) **رجال السند والهند**، از: حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ۔ (۲) **موقف ابن تيمية من التصوف والصوفية**، از: شیخ دکتور محمد بن احمد بنانی۔ (۳) **هداية المرشدين**، از: حضرت علامہ علی محفوظ مصریؒ۔ (۴) **إلى علماء نجد**، از: شیخ ہاشم رفاعی، کویت۔ (۵) **من أدب الإسلام**، از: حضرت علامہ عبدالفتاح ابوغدہ شامیؒ۔ (۶) **العقد الثمين في معالم دار الرسول الأمين**، از: شیخ محمد امین غالی شنقیطی۔ (۷) **فقه أهل العراق و حديثهم**، از: حضرت علامہ زاہد کوثری مصریؒ۔ (۸) **أوليات عمر الفاروق** ؓ، از: حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ۔ (۹) **فرقان القرآن بين صفات الخالق و صفات الأكوان**، از: شیخ علامہ قضاعی مصری شافعیؒ۔ (۱۰) **كتاب الفتن**، از: حضرت علامہ نعیم بن حماد مروزیؒ۔

راقم السطور کو مولانا بستویؒ کی ترجمہ کردہ عربی کتابوں کے ساتھ ان کے اردو مضامین بھی کثرت سے پڑھنے کا موقع ملا ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ مولانا ہمارے علمی حلقوں کے ان گنے چنے افراد میں سے تھے جو

عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ عربی اور اردو دونوں سے واقفیت رکھنے والے کئی دیگر اہلِ علم کو بھی پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے لیکن یہ بات بغیر کسی تامل کے کہی جاسکتی ہے کہ دونوں زبانوں میں قلمی مہارت اور زبان کے مخصوص مزاج کی رعایت کر کے لکھنے کا کمال تین چار ہی کے یہاں دکھائی دیا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر عربی زبان کا غلبہ ہے اور اردو کے مقابلے اس سے زیادہ شغف رہا ہے تو اردو سے واقفیت کے باوجود لکھتے وقت اردو تحریر میں عربی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اردو کی سلاست و روانی، سادگی، حسن و جمال اور سبک خرامی رخصت ہو جاتی ہے۔ عربی سے درآمد شدہ غیر ضروری تعبیرات، لفظیات، مخصوص طرزِ تحریر اور بوجھل تراکیب کے باعث اردو کا سارا لطف پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح معاملہ تب بھی بگڑ جاتا ہے جب عربی سے زیادہ اردو کا مشغلہ رہا ہو تو اس صورت میں عربی تحریر سے اس کا جمال وجلال، اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی رفعت و شوکت ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا بستویؒ کی تحریروں میں عربی اور اردو دونوں زبانوں کی خوبصورتی باقی رہتی تھی، عربی لکھتے تو عربی اسلوب کی پاسداری کرتے اور اس میں دور دور تک اردو کا رنگ یا اثر ظاہر نہ ہوتا، اردو لکھتے تو صاف ستھری اردو لکھتے جس میں سادگی کے ساتھ کہیں کہیں ادبیت بھی ہم دوش ہوتی۔

اپنی بات کے ثبوت کے لئے میں مولانا کی تحریروں کے صرف دو نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مولانا کی عربی تحریر کا رنگ دیکھئے ''مختارات الإمام الکشمیری'' میں حضرت مولانا سیّد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

**''إنه كان مدرساً موهوبًا يمتلك ناصية العلوم كذلك كان خطيبًا مصقعًا سحر المستمعين بعذوبة خطابه، وفصاحة لسانه، وغرر علومه. فجال خطيبًا في ولايات الهند، وأنحاء باكستان، ومناطق بنجلاديش، وفي كل دولة من دول العالم يعيشهاالجاليات الإسلامية من الهند و باكستان يعظ الناس ويذكرهم.**

**هذا وكان أديبًا فريداً باللغة الأردية له رنات وصيحات تستميل قلوب القراء وتستلفت أنظارهم. فكتب آلافا مؤلفة من المقالات بالأردية حول مواضيع: الدين، والدعوة، والتعليم، والاجتماع، والسياسة. كما وضع أربعة عشر مؤلفا علميا هامًّا من أهمها ''مختارات الإمام محمد أنور شاه الكشميري''.**

مولانا کی اردو تحریر کا انداز بھی دیکھیں، والد محترم کی کتاب ''میرے عہد کا دار العلوم'' کی تعارفی سطور میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے (مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے) ایشیاء کے اس سدا ربہار چمنستانِ علم وفضل سے خوشہ چینی کی اور اس کی روحانی فضاؤں میں سانسیں لے کر جوان ہوئے۔ ان کے عہد میں رنگ چمن کیا اور کیسا تھا، اس کی بہاروں میں کیسی مست خرامی اور پاکیزہ مزاجی تھی، اس کے پھولوں کی مہک سے سارا گلستان کس قدر اور کس طرح معطر تھا اور یہاں تعلیم وتربیت، مردم سازی وکیمیا گری، اخلاص وعمل اور اخلاق وکردار کی کیا کچھ گرم بازاری تھی؟ اس کا آنکھوں دیکھا حال، اس کی سچی تصویر، اس کا درست منظر نامہ، انہوں نے حروف والفاظ کے دیدہ زیب قالب میں پیش کیا ہے۔ آفریں صد آفریں! مبارک صد ہزار مبارک! چمنستان علم وحکمت سے نزدیک اور دور ہر ایک کے لیے قیمتی سوغات، گراں بہا تحفہ بلکہ گنج گراں مایہ ہے، گراں قدر بھی اور مستند ومعتبر بھی۔''

علمی اعتبار سے یہ زمانہ قحط الرجال کا ہے، یکے بعد دیگرے اہلِ علم رخصت ہو رہے ہیں اور اپنی خوبیاں، اپنے کمالات، اپنی قابلِ رشک صفات اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ عظمتوں کے ان میناروں کے کوچ کر جانے کے بعد تلاش کیجئے تو نہ وہ علم کی روشنی نظر آتی ہے، نہ کردار وعمل کی خوشبو کہیں ملتی ہے۔ مولانا بستویؒ بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک متاعِ گراں مایہ تھے، وہ ایک بہترین عالم دین، منفرد و محبوب استاذ، کامیاب منتظم، ممتاز صاحبِ قلم، دلِ دردمند رکھنے والے مشفق اتالیق ومربی تھے، ان کا اچانک ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت کے اعلی درجات نصیب فرمائے، درس وتدریس کی دنیا کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

# جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ جامعہ ہذا

## ماہانہ امتحان کا انعقاد

جامعہ میں ہر دو ماہ پر عربی درجات (اعدادیہ، عربی اول تا سوم و پنجم) کے طلبہ کا امتحان ہوتا ہے، جسے ماہانہ امتحان کا نام دیا گیا ہے۔اس امتحان میں 50 یا اس سے زیادہ کا اوسط لانے پر طلبہ کا طعام جاری ہوتا ہے، جب کہ 40 یا اس سے زیادہ پر پہلے سے طعام یافتہ طلبہ کا کھانا جاری ہی رہتا ہے۔

حسبِ سابق جامعہ میں ماہانہ امتحان منعقد ہوا، جس میں متعلقہ سارے طلبہ نے حصہ لیا۔اساتذۂ جامعہ نے سخت جانچ کر کے نمبرات اور کیفیات درج کیں، ساتھ ہی اپنے تاثرات بھی لکھے۔ ممتحنین نے جن کمزور گوشوں کی نشان دہی کی تھی، انہیں خط کشیدہ کر کے متعلقہ اساتذہ تک نتائج بھیج دیے گئے ہیں، تاکہ خامیوں پر مزید توجہ مبذول کی جاسکے۔

## شش ماہی امتحان کا اعلان

ماہانہ امتحان کے نتائج آنے کے ساتھ ہی جامعہ میں شش ماہی امتحان کی تاریخوں کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ امتحان 4 تا 9 ربیع الاول، مطابق 2 تا 7 نومبر منعقد ہوگا۔

اس امتحان کے لیے دار العلوم اور وقف دار العلوم سمیت اطراف و جوانب کے متعدد ماہر مدرسین کو مدعو کیا جائے گا۔امتحان کا اعلان آتے ہی طلبہ پر اس کا اثر دیکھا جانے لگا ہے۔مطالعہ و مذاکرہ میں مزید تیزی آئی ہے۔انہماک بڑھا ہے۔درسی کتابوں کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں۔

جامعہ کے ضابطے کے مطابق ایامِ امتحان میں طلبہ کسی بھی طرح کی رخصت نہیں لے سکیں گے۔ ہاں! شدید مرض کی صورت میں ڈاکٹر کی تصدیق کے بعد رخصت مل سکتی ہے۔

## تعطیلِ ششماہی کا اعلان

اعلانِ امتحان کے ساتھ ہی شش ماہی تعطیل کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ یہ تعطیل 10 سے 21 ربیع الاول تک جاری رہے گی۔طلبہ پر 21 تاریخ کی شام تک حاضری لازم ہے۔امتحان کا ایک پرچہ حسبِ سابق روک لیا گیا ہے۔ یہ پرچہ 23 تاریخ کو ہوگا، جس میں سارے طلبہ کی موجودگی ضروری ہے۔غیر حاضری کی صورت میں اخراج کر دیا جائے گا۔

## مسابقۂ خطابت کا اعلان

جامعہ کے طلبہ کی محبوب انجمن، جو انجمن کواکبِ انور کے نام سے متعارف ہے، نے مسابقۂ خطابت کے انعقاد کا اعلان کیا۔ یہ مسابقہ 17 اکتوبر کو ہوگا۔ طلبہ نے اس میں شرکت کے لیے بھی بھر پور تیاری شروع کر دی ہے اور زور وشور سے مقابلہ آرائی میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ سارا جوش خارجی اوقات میں نظر آتا ہے۔ اعلان کے مطابق ممتاز نمبرات والے طلبہ کو 1000، 700 اور 500 روپے کی کتب کی صورت میں خصوصی انعامات سے نوازا جائے گا، جب کہ شرکائے مسابقہ کو بھی 200، 200 روپے کی کتابیں تشجیعی انعامات دی جائیں گی۔

انجمن کواکبِ انور کے نگرانِ اعلیٰ محترم جناب مولانا نثار خالد دیناجپوری صاحب استاذِ حدیث جامعہ اور ناظم محترم جناب مولانا ابوطلحہ اعظمی صاحب استاذِ حدیث جامعہ نے بتایا کہ مسابقے میں تین پوزیشن رکھی جائے گی، پوزیشن یافتہ طلبہ کی کتابوں کے علاوہ نقد روپے سے بھی پذیرائی کی جائے گی۔

## رواقِ انظر کی تعمیر کا کام زوروں پر

جامعہ کے نئے دارالاقامہ کی تعمیر کا کام الحمدللہ زوروں پر ہے۔ لنٹر کے آس پاس تک تعمیر پہونچ گئی ہے۔ مسجد کے بائیں طرف واقع یہ زیرِ تعمیر دارالاقامہ بانیٔ جامعہ فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں 45 بڑے کمرے ہوں گے۔ جدید سہولیات سے آراستہ۔ قارئین سے اس کی جلد تکمیل کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

## محترم قاری مشتاق صاحب کے لیے دعائے مغفرت

12 اکتوبر 2019 کو ملک کی مشہور شخصیت جناب محترم قاری مشتاق صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں مقام عطا کرے۔

قاری صاحب مرحوم نامور صوفی حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ کے صاحب زادے تھے۔ لکھنؤ میں مدرسہ عالیہ فرقانیہ انہیں کا قائم کردہ ادارہ ہے، جس کا اہتمام بھی وہی سنبھال رہے تھے۔ انتقال کی خبر پر جامعہ میں دعائے مغفرت کی گئی اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

احقر کے رشتے کے ماموں جناب محمود الحسن صاحب کا بھی مختصر علالت کے بعد وصال ہو گیا۔ وہ ایامِ طالب علمی میں بندہ کے نگراں وسرپرست رہے ہیں۔ مدرسہ حسینیہ دارالعلوم پروہی میں احقر کی پوری طالب علمی انہیں کی نگرانی میں گزری۔ وہ اس مدرسہ کے دہائیوں استاذ رہے۔ جامعہ میں ان کے لیے بھی دعائے مغفرت ہوئی۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔

**Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband**

Register from Registrar of Newspapers for India U.P. URD.2000/R.N.10663

Contact: (Off) 01336-220471, Mob. +91 8006075484

Email: ahmadanzarshah@gmail.com

Printed & Published by Syed Ahmad Khizar Shah,
Mohtamim of behalf of JIMAS, Behind Eidgah, DBD
and Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers, Deoband



جامعہ کی مرکزی عمارت ''انور ہال'' اور مسجد انور شاہ پر مشتمل شاندار منظر



جامعہ میں زیر تعمیر جدید دارالاقامہ کا مجوزہ نقشہ



دارالاقامہ کا بیرونی منظر



مسجد انور شاہ

**Jamia Imam Mohammad Anwar Shah**
A/c No. 520101265117956
Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786